طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۵۰

/8/

۱۵ اگست کا پیغام

شام کے سفر سے واپسی پر حضرت عمرؓ نے دور دراز وادی میں ایک خیمہ دیکھا۔ حسبِ معمول آپ تحقیقِ احوال کیلئے خیمہ میں گئے تو وہاں ایک بڑھیا نظر آئی۔ بغیر بتائے کہ آپ کون ہیں، اس سے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ اس نے شکایت کی کہ حکومت کی طرف سے اس کی خبرگیری نہیں ہو رہی جس کی وجہ سے اسے تکلیف ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے حکومت تک اپنی تکلیف کی اطلاع بھی پہنچائی ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ یعنی اطلاع نہیں پہنچائی۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی اور کہا کہ جب تم نے اطلاع نہیں پہنچائی تو پھر خلیفہ کو اتنی دور سے تمہارا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ بڑھیا نے کہا کہ

جب عمرؓ کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو پھر خلافت کیوں کرتا ہے؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو اکثر دہرایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے اس حقیقت سے اس بڑھیا نے باخبر کیا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

اور جب رعایا کا حال معلوم ہو جاتا تھا تو پھر کیا ہوتا تھا؟

آپ ایک رات گشت کر رہے تھے کہ مدینہ سے تین میل باہر، ایک خیمہ میں بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے بھوکے ہیں اور سامانِ خوراک ختم ہو چکا ہے۔ آپ اسی وقت مدینہ واپس آئے۔ بیت المال سے آٹا، گوشت، کھجوریں وغیرہ لیں اور اپنے خادم سے کہا کہ اس سامان کو میری پیٹھ پر لاد دو۔ خادم نے کہا کہ میں اٹھا کر لئے چلتا ہوں۔ فرمایا کہ ان بچوں کے لئے بروقت سامانِ خوراک نہ پہنچانے کا جرم عمرؓ کا ہے۔ جب تم اس جرم کے بار کو قیامت کے دن نہیں اٹھاؤ گے بلکہ اسے عمرؓ کو خود اٹھانا پڑیگا تو اب تم اس بوجھ کو کیوں اٹھاؤ۔ عمرؓ خود کیوں نہ اٹھائے؟ چنانچہ سامان اٹھا کر خیمہ میں آئے۔ خود چولھا جھونکا۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے کھایا پیا اور اچھلنے کودنے لگے۔ بچوں کی والدہ نے کہا کہ

امیر المومنین بننے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ!

امیر المومنین عمرؓ جب اس واقعہ کو یاد کیا کرتے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ اُن بچوں کو اتنا وقت کیوں بھوکا رہنا پڑا تو کیا جواب دونگا!

"حکومت" کا تاج ہر بوالہوس کے سر پر راست آسکتا ہے لیکن "خلافت" کا بوجھ ہر کس و ناکس نہیں اٹھا سکتا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدلِ اشتراک	مرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	محمد یونس	آٹھ آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۸	اگست ۱۹۵۰ء	جلد ۳

فہرست مضامین

۱۵ راگست کا پیغام	۱	صلوٰۃ الوسطیٰ	۵۷-۶۳
لمعات	۳-۱۰	خواجہ عباد اللہ اختر صاحب	
سلیم کے نام ۔۔۔	۱۱-۲۳	۲۔ لاہوتی صاحب	
(پرویز صاحب)		نکات تلاوت	۶۴-۶۸
ایک اہم سوال	۲۴	(خوشی صاحب)	
سیری عالم اسلامی	۲۵-۵۲	نقد و نظر	۶۹-۷۵
(علامہ اسلم صاحب)		فردیات (نظم)	۷۶
اقبال کے نزدیک کائنات میں انسان کا مقام	۵۳-۵۶	(راسخ ملتانی)	
(نذیر قریشی صاحب)		اشتہارات	۷۷-۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ظہر الفساد فی البر والبحر

زندگی کے ہر گوشے میں ناہمواریاں نمودار ہوگئیں۔

مقامِ مسرت و اطمینان ہے کہ علی رغم انف عدو سرزمینِ پاکستان پر زندگی کا تیسرا سال بھی خیریت سے گذر گیا اور اس کے بدخواہوں نے اس سرزمین کی تباہی کے لئے جو منصوبے باندھ رکھے تھے وہ ان کی ہزار آرزوؤں اور کوششوں کے باوجود خاسر و نامراد رہے۔

باین مژدہ گر جاں فشانم رواست

دوسروں کے لئے پاکستان کی سرزمین شاید صرف اس لئے عزیز ہو کہ یہاں انہیں جان اور مال کی سلامتی کا گوشہ یا ان کی خوشحالیوں اور ترقیوں کا ذریعہ مل گیا۔ یہ امر بجائے خویش کچھ کم گراں قدر نہیں۔ دنیا میں امن و سلامتی کی ضمانت اور بہبودیوں اور مرفہ الحالیوں کی کفالت ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک پاکستان اس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے، اس لئے کہ اس کے تصورات کے مطابق یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمیں یہ امکانی قوت حاصل ہے کہ ہم چاہیں تو اس قرآنی نظام کو پھر سے مشہود صورت میں سامنے لے آئیں جو نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت کا موجب ہے اور جس کی عدم موجودگی سے انسانیت اس قدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے جب ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کا مقصد یہی بتایا تھا کہ اس سے مسلمان اس نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان حاصل کر لیں گے جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کی اور جسے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ان کے رسول نے متشکل کر کے دکھا دیا۔ طلوعِ اسلام اس پیغامِ حقیقت کشا کا نقیب اور اس دعوتِ انسانیت ساز کا علم بردار ہے، اس لئے اس کے نزدیک پاکستان کی سرزمین عزیز ترین متاعِ حیات ہے کہ اسی خاک سے وہ اس شجرِ طیب کی نمود بالیدگی کی توقعات رکھتا ہے جس کے متعلق خالقِ فطرت نے کہا ہے کہ اصلها ثابت وفرعها فی السماء۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ جو شے جس قدر زیادہ عزیز ہوتی ہے اسی قدر اس کی حفاظت کا فکر زیادہ گہرا ہوتا ہے جس بنا پر

باپ کا ایک ہی بچہ ہو اور اس بچہ کے ساتھ اس کی زندگی کی تمام آرزوئیں وابستہ ہوں وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یوسف کی محبت دیدہ یعقوب ہی سے پوچھی جا سکتی ہے۔

لیکن وہ محبت محبت نہیں دشمنی ہے جس میں تربیت کو نظر انداز کر دیا جائے یا اپنے آپ کو غلط اطمینان سے فریب میں رکھا جائے اور اس طرح حقائق سے چشم پوشی کر لی جائے۔ جس بچے سے محبت ہوتی ہے اسے کسی وقت چھینک بھی آجائے تو اس کا باپ فوراً کسی حکیم کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بچے کو تپ دق ہو رہی ہو اور وہ اس پر بھی یہ سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ بچہ بیمار ہے۔ یہی تقاضائے محبت ہے جس نے آج تک طلوع اسلام کو پاکستان کی داخلی خرابیوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ کشتی کا سوراخ صرف ملاحوں کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ کشتی کے مسافروں کا بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس لئے جو مسافر کشتی میں سوراخ ہوتے دیکھ کر اس لئے خاموش رہے کہ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے، کشتی خراب ہوتی ہے تو نقصان ملاحوں کا ہے، اس سے زیادہ نادان کوئی نہیں۔ اور جب صورت یہ ہو کہ وہی مسافر اور وہی ملاح ہوں تو پھر ایسے وقت میں اغماض اور خاموشی نادانی ہی نہیں جرم بن جاتی ہے۔ طلوع اسلام اپنے اس فریضہ کا پوری طرح احساس رکھتا ہے اور یہی احساس ہے جو اسے اس پر مسلسل آمادہ رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کو تنقیدی نگاہ سے پرکھتا ہے تاکہ مرض کا علاج شروع ہی میں ہو جائے۔ آج کی صحبت میں بھی جو کچھ عرض کیا جائیگا وہ اسی احساس کا نتیجہ اور اس فریضہ کا مظاہرہ ہوگا۔

آپ کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے لاہور جہاں جی چاہے چلے جائیے (اور یہی حال مشرقی پاکستان کا ہے) سفر میں، حضر میں، شہروں میں، بستیوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، گھروں میں، محفلوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں، ریلوں میں، لاریوں میں، سڑکوں میں، گلیوں میں، کسی مقام پر جائیے اور کسی سے بات کیجئے آپ کو بالعموم ہر شخص نالاں و گریاں دکھائی دے گا کہ پاکستان میں ظلم، ناانصافی، رشوت ستانی، بددیانتی، اقربا پروری، اقربا نوازی، بداخلاقی، بےحیائی عام ہو گئی ہے۔ عدالتوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، غرضیکہ جہاں بھی انسانوں کو انسان سے واسطہ پڑتا ہے، کوئی معاملہ بھی اصول اور قانون کے ماتحت طے نہیں پاتا بلکہ ذاتی مفاد پرستیوں اور شخصی مصلحت کوشیوں کے مطابق فیصل ہوتا ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر صاحب اختیار اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ رشوت کے چرچے کھلے بندوں ہوتے ہیں، مراعات کی خرید و فروخت علی الاعلان ہوتی ہے اور جو چیزیں بازاروں میں علی الاعلان بکتی نہیں وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں بلیک مارکیٹ کی سیاہ چادر کے نیچے فروخت ہوتی ہیں۔ دفاتری شعبوں میں حکام بالا ماتحتوں کی نالائقی اور کام چوری سے نالاں ہیں اور ماتحت افسران بالا کی حرام خوری اور اعزہ نوازی کے شاکی۔ محتسبین کے متعلق شکایت ہے کہ سوئی کی چوری پر کہرام مچا دیتا ہے اور پہاڑ کے پہاڑ نہایت صفائی سے ہضم کرا دیئے جاتے ہیں۔ یہ باتیں ہر شخص کی زبان پر ہیں۔

دس میں شک اسی کو ہو سکتا ہے جو کبھی اپنے محلات کی خلوتوں سے باہر نکل کر عوام سے ملا جلا نہیں یا اگر کبھی باہر آتا ہے تو ان سرکاری نمائندوں کے نرغے میں گھرا رہتا ہے جن کا منصب ہی یہی ہے کہ وہ نہ عوام کو ان کے قریب ہونے دیں، نہ ان کی کوئی بات ان کے کان تک پہنچنے دیں اور ہر سوال کے جواب میں "ہر طرح خیریت ہے" کہہ کر ان کے حسنِ انتظام اور شائستگی نظم و نسق کے قصیدے پڑھتے رہیں۔ سنا ہے کہ پچھلے زمانے میں بادشاہ راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کیا کرتے اور پسند کرتے تھے کہ ——— کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ——— ہمارا خیال ہے کہ ہر وہ صاحب اقتدار جسے ان حقائق کی صداقت میں جو اوپر گذارش کئے گئے ہیں، کچھ شبہ ہو، اس طرح سے بھیس بدل کر کہیں سنیں کہ لوگ کیا کیا کہہ رہے ہیں، تو وہ خود اس کی شہادت دیں کہ لوگوں کے احساسات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں جو ہم نے بیان کئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے عام طور پر ضابطے اور اصول کا احترام اٹھتا جا رہا ہے اور ان کے دلوں سے پاکستان کی حکومت کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عناصر جو شروع سے پاکستان کے خلاف چلے آرہے تھے لیکن آج اپنی مصلحت کوشیوں کے تحت پاکستان کی کھلی کھلی مخالفت نہیں کر سکتے وہ اس صورتِ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو اور مشتعل کر رہے ہیں۔ اس سے کسی کے پیشِ نظر (خاکم بدہن) خود پاکستان کی تخریب ہے اور کسی کے سامنے حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونے کی آرزو۔ ایک مردِ مومن نے کہا تھا کہ

سفینہ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا

اور دوسرے مردِ مومن نے اس نیک فال کو پورا کر کے دکھا دیا ہے کہ

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہوگا

لیکن آج کاروانِ مورِ ناتواں کی یہ نرم و نازک کشتی ہے اور ہزاروں "خضر صورت" بدخواہ اس میں سوراخ کرنے کے درپے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی ان جرأتوں کا راز صرف اس میں ہے کہ یہاں وہ صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اگر کسی کو فطرت کے اس اٹل قانون پر یقین نہ بھی ہو کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا اگر اس میں ہر شے اپنے اصل مقام سے ہٹ چکی ہو تو بھی کم از کم تاریخ کی شہادتیں ہی اس کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہونی چاہئیں کہ جو حالات ہمارے ہاں پیدا ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو سلطنتوں کے زوال کے وقت ہوا کرتا ہے۔ گبن کی "انحطاط و سقوطِ رومتہ الکبریٰ" کی تاریخ اٹھائیے، وہ اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کے وقت اسی قسم کی صورتِ حالات بتاتا ہے۔ دور نہ جائیے، ابھی کل کی بات ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کو دیکھئے۔ اس کے آخری ایام میں ملک کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ دنیا میں

کمزور اور طاقتور سلطنتوں کے حالات کا موازنہ کیجئے وہی سلطنتیں کمزور ہوتی دکھائی دیں گی جن میں اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے ہوں گے۔ بیشک ساز و سامان اور اسلحہ بڑی چیز ہے لیکن جس ملک میں اخلاقی بنیادیں اس درجہ کھوکھلی ہو چکی ہوں وہاں ساز و سامان اور آلات و اسلحہ بھی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر قلبِ حساس کو خون کے آنسو رلا دینے کے لئے کافی ہے کہ تاریخ میں جو صورت سلطنتوں کے انجام کے وقت پیدا ہوتی تھی ہمارے ہاں وہ صورت آغاز ہی میں پیدا ہو گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سوائے ان بدنہادوں کے جو پاکستان کی مخالفت کا چور دل میں لئے بیٹھے ہیں کوئی پاکستانی بھی پاکستان کی تخریب کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ عوام نہیں ہو سکتے کہ انہیں سر چھپانے کیلئے کوئی اور جگہ نہیں۔ خواص نہیں ہو سکتے کہ ان کا موجودہ عروج پاکستان ہی کی بدولت ہے —— وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے —— لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اصلاح کا طریق یہ سمجھا گیا ہے کہ عوام اربابِ نظم و نسق کو کوستے رہتے ہیں اور اوپر کے طبقے والے عوام کی شکایت کرتے رہتے ہیں حالانکہ دونوں طبقے مل کر قوم بنتے ہیں اور جو حالات اس وقت پیدا ہو چکے ہیں وہ ساری قوم کے ہیں، کسی ایک طبقہ کے نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری یہ تمام قومی خرابیاں دبی ہوئی تھیں، اب انہیں ابھرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پہلے فسادِ خون اندر تھا، اب وہ پھوڑے اور پھنسیاں بن کر جلد پر نمودار ہو گیا ہے۔ خون کا فساد کسی ایک حصۂ جسم تک محدود نہیں ہوا کرتا، سارے جسم میں یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک بات البتہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ خود بخود انسان کو راہِ راست پر لے آیا کرتا ہے۔ ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے والوں سے اس قسم کی توقع بھی بے جا نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے حکومت نہیں کی تھی، اس لئے ہمیں ابھی حکومت کے سلیقے نہیں آتے لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ نالائقی (Inefficiancy) کا ظہور ہونا چاہئے، فقدانِ سیرت .... (Characterlessness) کا نہیں۔ سیرت (Character) کی بہت سی خامیاں ضبط سے دور ہو جایا کرتی ہیں اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر ضبط پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ اربابِ نظم و نسق اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے اپنے اندر ضبط پیدا کر لیں گے اور اس ضبط سے نظم و نسق کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں گی جو عدمِ ضبط سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت تک کے شواہد اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اربابِ نظم و نسق ضبطِ نفس (Discipline) پیدا نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو ان کی مثال سے عوام بھی اپنے اندر نظم و ضبط پیدا کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بڑی حد تک اربابِ حل و عقد کو قوموں کی تباہی اور کامیابی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل یہ بھی نہیں کہ فلاں گروہ اپنے اندر فلاں بات پیدا نہیں کر سکا۔ مسافروں کی ناعاقبت اندیشی سے یا ملاحوں کی خرابیٔ فکر و نظر سے، کشتی میں چھید ہو رہے ہیں اور سوال صرف یہ ہے کہ یہ چھید کس طرح سے بند ہوں۔ اگر چھید بند نہ ہوئے

تو نہ مسافر ہی باقی بچیں گے نہ ملاح۔

اس قسم کے حالات میں ایک طریقِ کار یہ ہوا کرتا ہے کہ قوم میں کوئی ایک شخصیت ایسی پیدا ہو جائے جو پورے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اپنے فیصلوں کو بچوں کے استاد کی طرح ناطقانہ طور پر منواتی چلی جائے۔ ایسی شخصیت محض اپنی صلاحیت اور بلندیٔ کردار کی بنا پر زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے، اسے عوام کی سستی مقبولیت (Cheap Popularity) کی قطعاً فکر نہیں ہوتی۔ وہ ایک مشفق جراح ہوتا ہے جو مریض کی چیخ و پکار کی پروا کئے بغیر لاعلاج حصوں کو کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور قابلِ اصلاح زخموں میں نشتر پیوست کئے چلا جاتا ہے۔ ترکی کی مثال شاہد ہے کہ ایسے گئے گزرے حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس قسم کی شخصیت کا ابھر کے افقِ قوم پر نمودار ہو جانا قوم کی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کی شخصیت قوم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی۔ مصطفےٰ کمال خلیفہ عبدالحمید اور خلیفہ عبدالمجید کی ترکی کی پیداوار نہ تھا۔ لہٰذا یہ بھی کوئی طریقِ علاج نہ ہوا۔ اس لئے کہ جو دوا ہی اپنے اختیار کی نہیں اس کا تریاق ہونا کس کام کا۔ اس کیلئے تو یہی کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ جس طرح ہنگامی طور پر پاکستان کی زمین مل گئی اسی طرح اتفاقی طور پر اس کے سنبھالنے والا بھی پیدا ہو جائیگا۔

لہٰذا بات یہاں آکر ٹھہری کہ ان حالات میں اصلاح کی صورت کیا ہو؟ یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ہمارا موجودہ اوپر کا طبقہ اپنے اندر غالباً کسی تبدیلی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ بالعموم سن رسیدہ ہے اور اس عمر میں اس قالب کا توڑنا بڑی ہمت کا کام ہوا کرتا ہے جس میں انسان کی عادات و اطوار ڈھل چکی ہوں۔ لہٰذا ان سے کسی تبدیلی کی توقع کرنا بیکار ہے۔ نہ ہی یہ تدبیر کچھ مفید مطلب ہو سکتی ہے کہ ان کی جگہ دوسرے آدمی لائے جائیں، اس لئے کہ وہ بھی انہی قالبوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ آپ نے سندھ میں وزارتوں کی تبدیلیوں اور پنجاب میں اس کے تعطل کو بھی آزما دیکھا۔ قوم ساری ایک جیسی ہے اور کسی طبقہ کا یہ دعویٰ کہ اسے دوسرے گروہ پر کوئی افضلیت حاصل ہے محض انتخابی مہم کی تکنیک ہے خواہ اس پر شریعت کے لیبل لگا دیئے جائیں یا سرمایہ داری کی مخالفت کے۔ صورتوں کی تبدیلیوں سے سیرتیں نہیں بدل جایا کرتیں۔ اگر آج قوم میں کوئی ایک گروہ موجود ہے کہ جسے اپنے بلندیٔ سیرت کا دعویٰ ہو تو وہ انتخابی راستوں سے ہی اصلاح نہیں کر سکتا۔ سیرت کی بلندی تو جس مقام پر بھی ہو اپنا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ چندن قصرِ کسریٰ اور فقیر کی جھونپڑی میں یکساں طور پر خوشبو پھیلاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ صدیوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دناءت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے ید بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔

ایک چھوڑ تین پیغمبران کے اندر موجود تھے، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو، ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنھیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ ظاہر ہیں نئے ابھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے، نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رو سے کس قدر خام ہے۔ روئیے اس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں سکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں بھی سکول کھول دیجئے اور ہر سکول کا نتیجہ سو فی صدی دکھا دیجئے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (Literacy) اور تعلیم (Education) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (Values) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی۔ اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ (کہ وہ انھیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی (تزکیہ) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں

آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیڈروں کا گروہ یا حیلہ بازوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشوونما ہو جاتی ہے۔ اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر مشکل ہوتی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیش نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیرکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو ہی رفع کر سکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

تقسیم کے بعد قوم کو "قانونِ شریعت کو نافذ کرو" کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہو گیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبہ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت غور طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہو گا؟ اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا، اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز Trade Secret کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسر اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس قانون کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کون سی اصلاح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج بھی تو (چند مستثنیات کے علاوہ) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہرحال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کونسی تبدیلی پیدا ہو جائیگی؟ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانون شریعت نافذ ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ لہٰذا قانونِ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ نظامِ معاشرت کے بدلنے کا ہے۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ قوم کے دل و دماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو اس نظام کے قیام اور بقا کے ذمہ دار بن سکتے ہیں۔

اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعے سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجراء کا ہونا چاہئے۔ پھر سن رکھئے کہ قرآنی تعلیم سے مفہوم فن تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔ تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار اس طرح انسانیت کی نشوونما کا موجب بن سکتی ہیں اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ ہی محفوظ رہ جائیگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اسی خطہ کے رہنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورت حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اربابِ نظم ونسق کو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ملک میں صحیح قرآنی تعلیم کو نافذ کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے تین سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر لیں تو بھی ہماری بگڑی کو بنتے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے کہ وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح سے کیا جائے تو اس بارہ میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس اہم مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک پورا نصاب تعلیم تجویز کرے۔ اگر حکومت کو ضرورت ہو تو ہم یہ بھی بتا سکیں گے کہ ہمارے خیال کے مطابق اس اہم کام کے لئے کون کون سے لوگ موزوں ہیں۔

لیکن اگر قوم نے اس بنیاد کی ضرورت کا احساس نہ کیا اور اربابِ حکومت نے اپنے پیشِ نظر صرف یہی رکھا کہ عوام کو کس طرح سے خوش کیا جا سکتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ ہو گا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے کلرک پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کیلئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری مذہبی تعلیم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئے گا، اور پاکستان کی حالت یہ ہو گی کہ دنیا کے دوسرے "اسلامی ممالک" کی طرح اقوامِ مغرب کے رحم وکرم پر دنیا کے نقشے پر موجود رہے گا اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہو تو اس کا نام اس نقشہ سے بھی مٹایا جا سکے۔ ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً۔

سلیم کے نام ...

(پرویز)

سلیم! میری بیماری کے دوران میں تمہارے کئی ایک خطوط جمع ہو گئے تم اپنی جگہ پریشان ہو گے کہ خط کا جواب کیوں نہیں ملتا۔ میں اپنی جگہ پریشان تھا کہ میری خاموشی تمہارے لئے وجہ تشویش ہوگی اور اس لئے بھی کہ تمہارے استفسارات کا جواب جلدی ملنا چاہیئے تاکہ تمہاری کاوش و تحقیق، تذبذب میں نہ بدل جائے، کہ پھانس کا زیادہ دیر تک چبھے رہنا بعض اوقات ناسور کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ لیکن میں معذور تھا۔ اب بھی اگرچہ نسبتاً بہتر ہوں لیکن پوری طرح کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ یہ خط بھی املا کرا رہا ہوں، خود نہیں لکھ رہا۔

تمہاری حیرت بجا ہے کہ جو باتیں بظاہر مسلمات میں سے دکھائی دیتی ہیں جب انہیں ذرا کرید جائے تو وہ بھی حقیقت سے بعید نظر آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اُن چیزوں کو بھی، جو بظاہر مسلمات کی حیثیت سے اُن تک وراثتاً پہنچی ہوں، فکری تنقید سے نہ پرکھے۔ وائٹ ہیڈ کو تم جانتے ہو، اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

It requires avery unusual mind to undertake analysis of what is obvious.

(اس بات کیلئے ایک بڑے غیر معمولی دل و دماغ کی ضرورت ہے کہ جو باتیں عام طور پر مسلمات میں سے مانی جاتی ہیں ان کا تجزیہ کرے)

اس حقیقت پر غور کرو سلیم! بظاہر یہ چیز بڑی سطحی سی نظر آئے گی لیکن جونہی اس پر غور کرو گے یہ تمہیں ایک بہت بلند معیار کی طرف لے جائیگی۔ کتنی باتیں ہیں جنہیں ہم بطور مسلمات مانتے چلے جاتے ہیں اور اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ کہیں رک کر یہ دیکھیں تو سہی کہ وہ فی الواقعہ ایسی ہیں کہ انہیں بطور مسلمات مانا جائے۔ کتنے فریب ہیں جو محض اسی طرح رفتہ رفتہ حقائق بن جاتے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ذرا اس مسئلہ کا تجزیہ تو کرو کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے؟ اور تجزیہ کرنے کے بعد تم نے خود دیکھا تھا کہ یہ مسئلہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ بات میں نے مثالاً دہرائی ہے۔ ورنہ تم اگر غور کرو تو دیکھو گے کہ کتنی باتیں ہیں جو ہم صبح سے شام تک بطور مسلمات دہرائے چلے جاتے ہیں اور اس پر غور کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمات ہیں بھی یا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر وہ بات جسے ہم بطور مسلمہ مانتے ہیں تجزیہ کے بعد

ضرور غیر حقیقی ثابت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مبنی علی الحقیقت ہی ہو۔ لیکن جو چیز اس طرح فکری تنقید کے بعد بطور مسلمہ مانی جائیگی وہی ایمان محکم کا درجہ رکھے گی۔ فکری تنقید میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہارے پاس اس کے مبنی علی الحقیقت ہونے کیلئے خدا کی طرف سے سند مل جائے، اور یہ سند ایک مسلمان کیلئے قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم ان تمام باتوں کو جنہیں ہم بطور مسلمات مانتے چلے آرہے ہیں، اس فکری تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں اور اس کے بعد صرف انہی کو مسلمات میں سے تسلیم کریں جو قرآن کی کسوٹی پر پوری اتریں۔ قرآن نے تقلیدی روش کی جو اس قدر مخالفت کی ہے تو اسی لئے کہ جن چیزوں کو ہم تقلیداً مانتے ہیں ان کا ہم کبھی فکری تجزیہ نہیں کرتے، نہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تائید میں خدا کی طرف سے بھی کوئی سند ہے یا نہیں۔ تقلیدی روش کے مسلمات ہی کو وائٹ ہیڈ نے "What is obvious" کہہ کر پکارا ہے۔ قرآن ہر مسلمان (بلکہ ہر انسان) کو تاکید کرتا ہے کہ لا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ کہ جس بات کا تمہیں خود علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو سماعت، بصارت اور فؤاد ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے فلاں بات کے صحیح ہونے کی تائید کی تھی۔ میں اس خط میں اس عظیم الشان حقیقت کی وضاحت کی گنجائش نہیں پاتا جو اس آیت میں قرآن کریم نے علم کی تعریف (Definition) کے طور پر بیان کی ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہو جائیگی اور اس میں افلاطون (Plato) کے نظریۂ علم سے لے کر آج تک کے نظریات کو سامنے لانا ضروری ہوگا، اور اس کے بعد یہ بتانا کہ قرآن نے علم کی جو تعریف کی ہے اس میں کس طرح اس ثنویت (Dualism) کو مٹایا ہے جو تصوراتی (Idealism) اور حواسی (Perceptualism) کے فلسفیانہ نظریات نے پیدا کر دی ہے۔ اس وقت مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام مسلمات کو اس علم کی کسوٹی پر پرکھیں جس میں سمع اور بصر اور فؤاد (Mind) سب کی شہادات موجود ہوں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کہ میں (یعنی رسول) اور اس کی روش پر چلنے والے خدا کی طرف جو دعوت دیتے ہیں تو وہ دعوت بصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہاں پہنچکر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ایک طرف قرآن ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے (ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب) اور دوسری طرف وہ ایمان کو علی وجہ البصیرت قرار دیتا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اور باتوں کی طرح ایمان بالغیب کا مسلہ بھی محتاج تجزیہ ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ دنیا میں ایک نظام قائم ہے۔ وہ اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے۔ اس کے خلاف ایک پکار اٹھتی ہے کہ یہ نظام انسانیت کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ پکارنے والا ایک دوسرا نظام پیش کرتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ یہ نظام انسانیت کی نشوونما اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا نظام ابھی محض لفظوں میں ہے اور اپنے نتائج پیدا کر نہیں سکتا تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے۔

اور اس کا عملی نفاذ ناممکن ہے تاوقتیکہ کچھ ایسے انسان موجود نہ ہوں جو اسے نافذ کریں۔ اور نافذ بھی انسان کر سکتے ہیں جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوں، یعنی انہیں یقین ہو کہ یہ نیا نظام وہ نتائج پیدا کر کے رہے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مطالبہ کریں کہ ہم اس نظام کی صداقت کے قائل اسی صورت میں ہوں گے کہ اس کے نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو یہ ایسا ہی مطالبہ ہوگا جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں پانی میں اس وقت اتروں گا جب مجھے پہلے تیرنا آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ تیرنے کیلئے پانی میں اترنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس نئے نظام کے نتائج دیکھنے کے لئے اس نظام کو عملاً نافذ کرنا ضروری ہے۔ اس جماعت کیلئے جو اس نظام کی تنفیذ میں پہل کرے گی (جسے قرآن نے السابقون الاولون کہہ کر پکارا ہے) یہ ضروری ہے کہ اس نظام کے نتائج کو بغیر دیکھے صحیح مانے (اس "بن دیکھے ایمان" کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ یہی جماعت جب بن دیکھے نتائج پر ایمان لاکر اس نظام کو عملاً نافذ کردے گی تو وہی بن دیکھے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے اور بعد کے لوگ ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہوگا۔ اس پہل کرنے والی جماعت کے ایمان کے محرک، نظام کے نتائج کی جگہ اور شواہد ہوتے ہیں۔ بعض کے لئے خود اس نظام کی معقولیت اور بعض کیلئے اس نظام کی طرف دعوت دینے والے کی سیرت کی عظمت۔ جب اس طرح سے نظام کی ابتدا کردی جائے تو پھر ہر قدم پر ابھر کر سامنے آنے والے نتائج خود اس کی صداقت کی دلیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ استنتاجی دلائل (Pragmatic test) آنے والوں کیلئے آیات اللہ، یعنی نظامِ خداوندی کی کھلی کھلی نشانیاں بن جاتی ہیں۔

اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ ایمان بالغیب سے صحیح مفہوم کیا ہے اور ایمان علیٰ وجہ البصیرت کسے کہتے ہیں۔ قرآن کا علمی معیار بہرحال ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس کے دلائل اور شواہد میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ آج ہمارے پاس خدا کی کتاب بطور محکم سند کے موجود ہے۔ ہمارے لئے کوئی سے نئے مسلک کی حیثیت نہیں رکھ سکتی جب تک ہم اسے اس علمی معیار پر پرکھ کر نہ دیکھیں۔ قرآن علم اور عقل کے لئے اسی طرح راہنمائی کا کام دیتا ہے جس طرح انسانی آنکھ کیلئے سورج کی روشنی۔ ہم ہر اس شے کو جو ہمارے سامنے بطور مسلمہ کے پیش کی جاتی ہے، قرآن کی روشنی میں علم اور عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تقلیدی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ منزل بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر رسول کی دعوت کی تکذیب ان کی طرف سے ہوئی جو اُن مزعومات کو جو انہیں ورثتاً ملے تھے، مسلمات مانتے چلے آرہے تھے اور اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ ان مسلمات کو (جو اُن کے نزدیک Obvious تھے) علم و عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ ہمارے ہاں جن چیزوں کو مسلمات کی حیثیت حاصل ہے ان میں سے بھی بیشتر کی یہی کیفیت ہے۔ تم اگر ان مسلمات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھو تو تم حیران رہ جاؤ گے کہ کس قدر غیر حقیقی نظریات ہیں جو یکسر حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ یہود، نصاریٰ اور مجوسی قومیں جب کھلے بندوں اسلام کے

دین کی حریف نہ ہو سکیں تو انھوں نے اس دین کے خلاف ایک منظم سازش کی۔ جس طرح سینٹ پال جب دورِ اول کے عیسائیوں کو اذیتوں اور تکلیفوں کی بنا پر شکست نہ دے سکا تو اس نے خود عیسائیت کا نقاب اوڑھ لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آوردہ دین کی جگہ اپنا بنایا ہوا مذہب ہر طرف پھیلا دیا۔ چنانچہ آج دینِ عیسوی کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ہر عیسائی، مذہبِ پولوس کا پرستار ہے۔ اسی طرح اسلام سے شکست خوردہ یہودی، نصرانی اور مجوسی قوتوں نے مسلمانوں کا نقاب اوڑھا اور دینِ خداوندی کی جگہ آہستہ آہستہ اپنے نظریات و معتقدات کو مذہبِ اسلام کی شکل میں پھیلا دیا۔ آج ہمارے مروجہ مذہب میں بہت کم حصہ ایسا ہے جو اس دین پر مشتمل ہے جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔ باقی سب انہی اقنوم ثلاثہ کی اختراعات پر مبنی ہے۔ نصاریٰ کی خانقاہیت (Otherworldliness) یہودیوں کی رسوم پرستی (Ritualism) اور ایرانی مجوسیوں کی شخصیت اور نسل پرستی (Ancestral worship) یہ ہیں عناصر موجودہ مذہبِ اسلام کے۔ میں اسی کو مذہب کہتا ہوں اور قرآن کے نظامِ زندگی کو دین، کہ قرآن نے دین ہی کو پیش کیا ہے، مذہب کو نہیں۔ مذہب کا تو لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔

آج جس چیز کا نام احیائے دین اور شریعت کا نفاذ رکھا جاتا ہے اور ہر طرف سے مسلمانوں کو اس کی طرف آنے کی دعوت دی جاتی ہے وہ درحقیقت انہی عناصرِ ثلاثہ کی طرف مراجعت کی دعوت ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کے مرتب کردہ نظریات بطور مسلمات (obvious) ہمارے ہاں متوارث چلے آرہے ہیں اور یہی وہ مسلمات ہیں جن کے تنقیدی تجزیہ کے بغیر ہم اصل دین تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ عیسائیت اگر آج چاہے بھی تو مذہبِ پولوس سے چھٹکارا حاصل کر کے دینِ عیسوی تک نہیں پہنچ سکتی کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ لیکن ہمیں یہ خصوصیت (Privilege) حاصل ہے کہ ہمارے پاس ضابطۂ خداوندی (قرآن) محفوظ شکل میں موجود ہے۔ یہ دورِ سلیم! ہماری تاریخ میں (ہماری تاریخ ہی نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ میں) بڑا نازک دور ہے۔ اس موڑ پر قدرت نے ہمیں ایک امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کر سکیں جو انسانی فلاح و بہبود کیلئے تجویز کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے اسے اس کی اصلی شکل میں قائم کر دیا تو نہ صرف یہ کہ ہم اپنے آپ ہی کو اونچا لے جا سکیں گے بلکہ فکر و نظر کی پریشانی میں الجھی ہوئی انسانیت کی امامت بھی کر سکیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور عجمی اثرات کا پیدا کردہ مذہب قانونی قوت کی حیثیت سے مسلط ہو گیا تو تم دیکھو گے کہ چند دنوں کے بعد ہم بھی اسی سطح پر آجائیں گے جس سطح پر دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے ممالک ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے غلط عقیدتمندی کی ہزار مقدس آرزوئیں بھی جھٹلا نہ سکیں گی کہ خدا کا قانون مقدس آرزوؤں کی رعایت سے اپنے نتائج روک نہیں لیا کرتا۔

میرا جرم یہی ہے کہ میں اپنے ہاں کے بدیہی مسلمات (obvious) کو جن پر ہم تقلیداً چلے آرہے ہیں، قرآن کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

تمہارے دوسرے سوال کا جواب ذرا زیادہ تشریح طلب ہے۔ میں نے اپنے گذشتہ سفر بلوچستان میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک ویران سی بستی کے قریب کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارات ہیں۔ ایک طرف ریلوے سگنل کا ٹوٹا ہوا کھمبا استادہ ہے، دوسری طرف ریل کا کانٹا موڑنے کا چکر ہے۔ ذرا فاصلے پر ریل کی پٹڑی کے دو چار ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ گاؤں کے ایک بڈھے نے بتایا کہ پہلے یہاں ریل کا اسٹیشن تھا۔ ہماری بستی اناج اور پھلوں سے بھری رہتی تھی۔ آنے جانے والے مسافروں کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی اور بستی کے لوگ خوشحال تھے۔ اب یہاں سے ریل اٹھا دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بستی نہیں ویرانہ ہے۔ نہ معلوم ہمارے کون سے گناہوں کی مار ہم پر پڑی۔ اب بڑی مشکل سے دن گذرتے ہیں۔ اس بڈھے نے ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ اس کی ایک دو پشتوں کے بعد جو بچے پیدا ہوں گے وہ اپنے ماں باپ سے ریل کی کہانیاں سنیں گے۔ اس کی برکات کے قصے سن کر وہ ریل کے متعلق عجیب سا تصور قائم کریں گے۔ ریل کے مقام پر وہ انہی ٹوٹے ہوئے کھمبوں اور بکھری ہوئی پٹڑیوں کے نشانات دیکھیں گے۔ چونکہ انھوں نے ریل دیکھی نہ ہوگی، اس لئے وہ یہی سمجھ بیٹھیں گے کہ وہ برکتیں انہی کھمبوں اور پٹڑی کے ٹکڑوں سے وابستہ تھیں۔ انھیں اگر کوئی سمجھانا چاہے کہ یہ کھمبے اور پٹڑیاں درحقیقت ریلوے کے عظیم القدر نظام کے اجزا تھے اور اس نظام کے اندر یہ اجزا لاینفک تھے۔ لیکن ریلوے کا نظام منتشر ہو جانے سے اب ان سے وہ نتائج نہیں برآمد ہو سکتے جن کے لئے یہ وضع کئے گئے تھے۔ تو یہ بات ان بچوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکے گی۔ ریل کو دیکھے بغیر وہ ریل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کھمبے اور پٹڑیاں اب کیوں بے نتیجہ قرار دیئے جا رہے ہیں اور اس وقت ان میں کون سی نئی قوت پیدا ہو جائیگی کہ ان کے ایک اشارے پر ریل مع اپنے تمام برکات کے اِدھر سے اُدھر چلتی پھرتی رہے گی۔

دین ایک نظام کا نام ہے۔ اس نظام سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کے انسان اس انداز سے مل جل کر رہیں کہ ہر فرد انسانی کیلئے اس کی فطری صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشوونما پانے کے اسباب اور مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ وہ نظام جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت (انسانی صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذریعہ بنے اور اس طرح دوسروں کی ربوبیت کی فکر اور اہتمام میں خود اپنی انسانیت کی ربوبیت کا سامان پائے۔ طبعی زندگی کی ضروریات تو اس نظام میں قدم اول سے بھی پیچھے کی بات رہ جاتی ہے۔ ربانی نظام ہر فرد کی تمام فطری صلاحیتوں کے مکمل نشوونما کا ذمہ دار ہو وہ انسان کی طبعی ضروریات کو کب

فراموش کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم القدر نظام کے اجزا کثیر التعداد اور مختلف النوع ہوں گے۔ نظام کے اندر ان اجزا میں سے چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی اپنا مقام، اپنی خصوصیت اور اپنی اہمیت رکھے گا اور اس نظام کلی کے نتائج مرتب کرنے میں اس کا بھی پورا پورا حصہ ہوگا۔ اور اس جزو کے صحیح طور پر کام نہ کرنے سے پورا نظام معطل ہو جائے گا، جس طرح ریل کی پٹڑی کے کسی ایک پیچ کے ڈھیلے ہو جانے سے تمام گاڑیاں اپنی اپنی جگہ رک جاتی ہیں۔ اسلامی نظام میں مختلف احکامات کی یہی حیثیت تھی۔ جب وہ نظام قائم تھا تو اس میں ہر نقل و حرکت جو نظام کے اصول کے مطابق ہوتی تھی، اس نظام کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتی تھی۔ لیکن جب نظام منتشر ہو گیا تو اس نظام کے یہی اجزا سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے چکروں اور پٹڑی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی طرح باقی رہ گئے۔ ہم نے اس نظام اور اس کی برکات کی باتیں سنی ہیں، اسے مشہود بکیہ میں دیکھا نہیں۔ اب ہم انہی سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے چکروں اور پٹڑی کے ٹکڑوں کو اس نظام کی برکتوں اور سعادتوں کا ذریعہ سمجھے بیٹھے ہیں، انہی پر ہم اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور انہی سے توقع کرتے ہیں کہ ہماری اجڑی ہوئی بستیاں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔ ان میں پھر سے ملک ملک کے اناج اور قسم قسم کے پھل آئیں گے۔ ہمارا کارواں پھر پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مصروف جادہ پیمائی ہو جائیگا۔ سلیم! سوچو کہ ان حسین اور مقدس آرزوؤں سے یہ توقعات کبھی بھی پوری ہو سکتی ہیں؟ ریل کے نظام کے اندر یہی کھمبے اور پٹڑیاں ان برکتوں اور سعادتوں کے ذریعے تھے۔ اس نظام کے باہر یہ بجائے خویش کسی برکت اور سعادت کا موجب نہیں بن سکتے۔ نظام کے اندر یہ دین کے اجزا تھے، نظام سے باہر یہ رسومات ہیں۔ مذہب، رسومات کے مجموعے اور ان سے وابستہ مقدس آرزوؤں کا نام ہے۔ دین کی صداقت کی دلیل اس کے زندہ نتائج ہوتے ہیں۔ مذہب کی صداقت اس کے ماننے والوں کی خوش عقیدگی سے باہر کہیں نہیں ہوتی۔ دین ایک چلتے پھرتے جاندار جسم نامی کے مثل ہوتا ہے، مذہب میں جسم مردہ کے الگ الگ ٹکڑے متبرک مقامات پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کا جو نظام دیا تھا اور جسے اس نے الدین کی جامع اصطلاح سے پکارا تھا، اگرچہ اس کے الگ الگ حصے نہیں کئے جا سکتے لیکن سمجھنے کے لئے یوں سمجھو کہ اس کا ایک حصہ وہ تھا جس سے افراد کی زندگی میں داخلی انقلابات پیدا ہوتے تھے اور دوسرا حصہ وہ تھا جو انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بنتا تھا۔ (اسے پھر سمجھ لو کہ یہ دو الگ الگ حصے نہیں تھے۔ داخلی انقلابات یعنی تغیر نفس کا لازمی نتیجہ ربوبیت عامہ اور ربوبیت عامہ کا فطری نتیجہ نفس انسانی کی نشوونما ارتقا تھا۔ میں نے یہ دو حصے محض تمہیں سمجھانے کیلئے الگ الگ کئے ہیں تاکہ تمہارے مزید استفسار سے بچ سکوں) ان دو حصوں کو قرآن نے اقیموا الصلوٰۃ اور اٰتوا الزکوٰۃ سے تعبیر کیا۔ الصلوٰۃ کی اصطلاح میں نفسیاتی تغیرات کا پورا نظام

اپنی سمٹی ہوئی شکل (Miniature form) میں منعکس ہوجاتا ہے اور الزکوٰۃ میں نشوونما دینے (ربوبیت) کے تمام اسباب وذرائع سموجاتے ہیں۔ الزکوٰۃ کے معنی ہی نشوونما (growth) کے ہیں۔ الصلوٰۃ ایک مسلم کی زندگی کے ہر سانس کو محیط ہوتی ہے۔ اس کی ہر نقل وحرکت، اس کی فکر، اس کے ارادے، ان ارادوں کے مظاہر تمام کے تمام الصلوٰۃ ہی کے مظہر ہوتے ہیں۔ الصلوٰۃ، صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔ وہ صراط جس کے متعلق فرمایا کہ ان ربی علی صراط مستقیم ۔ میرے نشوونما دینے والے کا قانون ربوبیت خود متوازن راہ پر چل رہا ہے۔ اسی کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں پہلے نمبر کے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو۔ جو اِدھر اُدھر کی راہوں میں نکل جائے وہ مصلّی نہیں۔ اسی لئے سورۃ القیامہ میں نظامِ اسلامی سے منہ موڑنے والے کے متعلق فرمایا فلا صدق ولا صلّٰی ۔ ولکن کذب وتولّٰی (۷۵/۳۱) کہ وہ تصدیق نہیں کرتا اور نہ ہی صلوٰۃ کا پابند ہے بلکہ تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں اختیار کرتا ہے۔ دیکھو سلیم! یہاں تصدیق کے مقابلہ میں تکذیب ہے اور صلّٰی کے مقابلہ میں تولّٰی یعنی گریز کی راہیں نکالنا۔ اس لئے مصلّی وہی ہوگا جو متوازن راہ (صراطِ مستقیم) پر اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کے عین پیچھے چلتا جائے اور ادھر اُدھر منہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ سجدہ سے مراد ہی قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ سورۂ علق میں دیکھو۔ حضورؐ سے فرمایا گیا کہ نظامِ خداوندی سے منہ موڑنے والے کی اطاعت مت کرو (لا تطعہ) بلکہ واسجد واقترب (۹۶/۱۹) بلکہ سجدہ کر اور قریب ہوجا۔ یعنی سجدہ ہر غیر خداوندی قانون کی اطاعت سے انکار اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کا مظہر ہے۔ اسی طرح سورۂ مرسلات میں مجرمین اور مکذبین کے متعلق کہا گیا ہے کہ واذا قیل لہم ارکعوا لا یرکعون (۷۷/۴۸) کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو یہ رکوع نہیں کرتے۔ یعنی قانونِ خداوندی کی تکذیب اور اس سے سرکشی رکوع سے مانع ہوتی ہے۔ لہٰذا رکوع کے معنی قانونِ خداوندی کی عملی تصدیق اور اس کے سامنے جھک جانا ہے۔ سورۂ اعراف میں دیکھو، قانونِ خداوندی کے ساتھ کامل تمسک کا دوسرا نام اقامتِ صلوٰۃ رکھا گیا ہے۔

والذین یمسکون بالکتٰب واقاموا الصلوٰۃ ۔ انا لا نضیع اجر المصلحین ۔

(متقی وہ ہیں جو) قانونِ خداوندی کے ساتھ پورا پورا تمسک رکھتے ہیں یعنی صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ ہمواریاں پیدا کرنے والے (مصلحین) ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

تمسک بالکتاب یعنی قانونِ خداوندی کا عملاً اتباع ناممکن ہے جب تک کہ دین کا نظام عملاً جاری وساری نہ ہو۔ اور چونکہ اقامتِ صلوٰۃ بھی اسی نظام ہی سے وابستہ ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ بغیر تمکن فی الارض (یعنی کسی خطۂ زمین میں قرآنی حکومت قائم کئے بغیر) ناممکن ہے۔ سورۂ حج میں دیکھو کس قدر واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جب ہم لوگوں کو جو

قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ حصہ صلوٰۃ کو قائم کریں گے اور الزکوٰۃ کا انتظام کرینگے (۲۲/۴۱) دوسری طرف سورۂ نور میں دیکھو۔ استخلاف فی الارض اور تمکن دین کو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے مشروط ٹھہرایا گیا ہے (۲۴/۵۵)۔ اور آگے چلو۔ سورۂ شوریٰ میں جہاں یہ فرمایا کہ وامرھم شوریٰ بینھم (کہ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے طے پائے گی) اس سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ اور اس کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں (۴۲/۳۸)۔ سورۂ حج میں جہاں قرآنی نظام قائم کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ان کا فریضۂ زندگی یہ ہوگا کہ وہ نوعِ انسانی کے اعمال کے نگراں ہوں گے اس کے ساتھ ہی فرمایا فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ (۲۲/۴۱) اور اس کے بعد کہا واعتصموا باللہ۔ یعنی قانونِ خداوندی سے اعتصام اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ سے ہی ممکن ہے۔ سورۂ اعراف میں دیکھو کہ پہلے فرمایا قل امر ربی بالقسط کہ میرے نشوونما دینے والے کے قانون نے یہ کہا ہے کہ نظامِ ربوبیت کیلئے توازن اور تناسب قائم کرنا ضروری ہے (قرآن میں عدل اور قسط اور وسطیٰ کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہیں اور انہی پر پورے نظامِ ربوبیت کا مدار ہے۔ لیکن ان کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ انھیں یا تو کسی دوسرے خط میں لکھوں گا اور یا پھر تبیین معارف القرآن کی اگلی جلد کا انتظار کرنا ہوگا جس میں اسلام کا معاشی نظام یعنی ربوبیت شرح وبسط سے آجائیگا) اس کے بعد فرمایا کہ واقیموا وجوھکم عند کل مسجد کہ نظامِ ربوبیت میں توازن قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تم اپنے اعمال اور افکار کے رخ میں صحیح سمت اختیار کرو اور یہ سمت خدائی قانون کے ساتھ اپنا رخ متوازی رکھنے سے حاصل ہوگی۔ اور اس کے بعد فرمایا وادعوہ مخلصین لہ الدین اور خالص نظامِ زندگی اسی قانون کے ذریعہ سے قائم ہوسکے گا۔ غور کرو سلیم! اگر قیامِ صلوٰۃ سے مقصود یہ ہماری نمازیں ہی ہوں تو ان کے لئے تمکن فی الارض یعنی ملک میں قرآنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ نمازیں تو ہم انگریز کی غلامی میں بھی پڑھا کرتے تھے اور آج بھی بلا روک ٹوک پڑھ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض بتلایا ہے۔ ہماری ان نمازوں سے ہمیں کب استخلاف ملا۔ سورۂ بقرہ میں دیکھو۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۲۷۴) کہ ان لوگوں پر جو نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔ (۱) غور کرو کہ کیا ہماری نمازیں اور اڑھائی فی صدی والی زکوٰۃ یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہے کہ ہمیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہو۔ صلوٰۃ کے متعلق سورۂ عنکبوت میں بین الفاظ میں ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵) یقیناً بلاشک وشبہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے۔ سلیم! اس حتم اور یقین کو سامنے رکھو جس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے اور پھر اس کے بعد دیکھو کہ کیا ہماری موجودہ نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں۔ سورۂ روم میں دیکھو کیسے حسین اور بلیغ انداز میں اقامتِ صلوٰۃ کے دونوں گوشوں کے فطری

نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا واتقوہ یعنی قانونِ خداوندی سے پوری ہم آہنگی پیدا کرو۔ اس کے بعد کہا واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم۔ یعنی اس قانون سے ہم آہنگی کا عملی نتیجہ نظامِ خداوندی کی تشکیل ہوگی اور اس نظام کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان جو اس نظام کے بغیر گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے اور اس طرح وحدتِ قانون سے وحدتِ نظام اور وحدتِ نظام سے وحدتِ انسانیت مشہود ہو جائیگی (۳۰/۳۱-۳۲)

یہاں پہنچ کر سلیم! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ نماز کے نام سے جو کچھ آج مسجدوں میں کیا جاتا ہے کیا اس کی بھی کچھ اصلیت ہے۔ اس کا جواب 'ہاں' میں بھی ہے اور 'نہیں' میں بھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ فوج کے ایک سپاہی کی ساری زندگی سپاہیانہ ہوتی ہے لیکن بایں ہمہ کچھ وقت کے لئے ہر روز ہر سپاہی کو اس نقل و حرکت کی یاددہانی کیلئے ایک میدان میں بلایا جاتا ہے، جو نقل و حرکت انھیں میدانِ جنگ میں کرنی پڑتی ہے۔ ایک نفسیاتی کیفیت (Psychology) افراد کی ہوتی ہے اور ایک اجتماع کی جسے (Mass psychology) کہا جاتا ہے۔ اجتماع اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے لیکن اجتماعی نفسیات، افراد کی نفسیات سے ایک الگ خصوصیت رکھتی ہے۔ اجتماعی نفسیاتی کیفیت افراد کی نفسیاتی کیفیتوں کا حاصلِ جمع (Sum total) نہیں ہوتی، اس سے کہیں زیادہ اور منفرد نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسلام نے دین کے نظام کی یاددہانی کے لئے صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات کو تجویز کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اجتماعات اس نظام کے لاینفک پرزے ہیں۔ لیکن اگر نظام مفقود ہو اور ہم رسمی طور الگ الگ یا مساجد میں جمع ہو کر رکوع اور سجود کر لیا کریں تو ان کی مثال اسی سگنل کے کھمبے یا ریل کی پٹڑی کے ٹکڑے کی سی ہوگی جو ریل بند ہو جانے کے بعد اس بستی میں پڑے ہوئے تھے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک سپاہی کیلئے وردی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی سپاہی فوج سے برطرف ہو جانے کے بعد اپنے گاؤں میں ہر روز صبح اٹھ کر نہایت احتیاط اور انتظام سے اپنے بوٹ کے تسموں سے لے کر سر کی ٹوپی تک ہر شے نہایت باقاعدگی سے پہنے اور بندوق کی جگہ ڈنڈا اٹھا کر چپ راست بھی کرتا رہے تو اس کا یہ عمل کسی ذاتہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرے گا حالانکہ فوج کے اندر ان میں سے ہر شے مجموعی نتائج مرتب کرنے کیلئے لاینفک تھی۔ یہ ہے وہ وجہ جس کیلئے میں نے کہا ہے کہ نماز کی یہ ظاہری شکل و صورت اپنی اہمیت بھی رکھتی ہے اور نہیں بھی۔ جب یہ نظام دین کا جزو بنتی ہے تو اس کی ہر حرکت خاص اہمیت رکھتی ہے اور جب اسے اس سے الگ نکال لیا جاتا ہے تو ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ دین میں یہی اجزا نظامِ دین کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور مذہب ان کو مقصود بالذات قرار دیدیتا ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس فرق کو کس خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب۔ یعنی کشادگی راہ یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرو یا مغرب کی طرف۔ یہ مذہب کی رسم ہے جو

فی ذاتہ کوئی نتیجہ اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اس کے بعد فرمایا ولکن البر "لیکن اصل کشاد کی راہ یہ ہے کہ ـــــ اس کے بعد قرآنی نظام کے مختلف اجزا کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ یعنی یہی نظامِ دین کے بنیادی عمود۔ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی سے نفسیاتی تغیر اور ربوبیتِ عامہ (انسانیت کے نشوونما) کے اسباب و ذرائع کی فراہمی۔ یہ ہے اصل کشاد کی راہ۔ اب اس اقامتِ صلوٰۃ میں ہر ایک کے رخ کا ایک خاص سمت کی طرف رکھنا بھی نہایت ضروری قرار پایا (وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہٗ۔ ۱۴۴) یعنی دین کے پورے نظام میں اپنے افکار و اعمال کا رُخ قانونِ خداوندی کے ساتھ متوازی رکھنا (انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفا) اور اس کی مظہری شکل میں تمام افرادِ جماعت کا رُخ نظامِ دین کے مرکزِ محسوس کی طرف رکھنا۔ غور کرو سلیم! وہی چیز (یعنی کسی خاص طرف رخ کرنا) جس کے متعلق ایک جگہ کہا تھا کہ وہ کشاد کی راہ نہیں، دوسری جگہ کتنا ضروری قرار پا گیا۔ وہ مذہب کی رسم تھی اور یہ دین کا جزو۔ اسی نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قرآن نے دین القیم کہہ کر پکارا ہے جہاں فرمایا وما امروا ـــــ تمہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ الا لیعبدوا اللہ بجز اس کے کہ تم صرف قانونِ خداوندی کی محکومی اختیار کرو مخلصین لہ الدین اور اپنا نظامِ زندگی خالصۃً اس کے قانون کے مطابق متشکل کرو حنفاء ٹھیک ٹھیک اسی کی سیدھ میں اپنا رخ قائم کرو۔ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ یعنی نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرو اور انسانیت کی نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرو۔ ذالک الدین القیم۔ یہ ہے وہ نظام جو اپنے اندر خود بھی توازن رکھتا ہے اور انسانیت میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

یہ ہے فرق سلیم! مذہب کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں۔ مذہب کی نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے اور دین کی صلوٰۃ انسانیت کے ارتقاء کا موجب ہوتی ہے۔

اب سلیم! تمہارا تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ ہم قرآنی دین سے جس قدر دور ہٹ چکے ہیں اور اس کی جگہ جس طرح انسانی ذہن کے پیدا کردہ اعمال اور افکار نے لے رکھی ہے اگر ہم میں قرآن اپنی محفوظ شکل میں موجود نہ ہوتا تو یہ تحریف اور فساد کی وہی صورت تھی کہ جس میں ازمنہ سابقہ میں نبی آیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ خدا کی کتاب اپنی اصلی صورت میں ہمارے ہاں موجود ہے۔ ضابطۂ دین ملنے کے بعد دین کے نظام کو کس طرح متشکل کیا جائے، اس چیز کو بھی قرآن کریم نے خود بیان کر دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب حرا کی تنہائیوں میں حقیقت بے نقاب کر دی گئی اور یہ بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کو اپنی نشوو ارتقا کیلئے کس قسم کے

نظامِ زندگی کو قائم کرنا ہوگا تو اس کے بعد آپ کو تزمیل کا حکم دیا گیا۔ تم نے سورۂ مزمل کو پڑھا ہے (کسی زمانہ میں تو تم اس کا ورد بھی کیا کرتے تھے)۔ یا ایھا المزمل (کہ جس کے معنی آج کل "اے چادر اوڑھنے والے" کیا جاتا ہے اور کسی کے پلے نہیں پڑتا کہ اس سے بات کیا بنی) اس سے مراد عملِ تزمیل میں شدت اختیار کرنے والا ہے۔ اونٹ کے کجاوے میں جو دو سواریاں بیٹھتی ہیں اور جن کے انتخاب میں اس امر کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان سے کجاوے کا توازن قائم رہے، انھیں ایک دوسرے کا زمیل کہا جاتا ہے۔ تزمیل کے معنی اسی قسم کے رفقائے سفر پیدا کرنا ہے اور مزمل اسے کہتے ہیں جو ایسے رفقائے سفر پیدا کرنے میں نہایت شدت اور انہماک سے مصروفِ سعی و عمل ہو۔ لہٰذا موجودہ فکری انتشار اور قلبی پراگندگی میں پہلا کام تزمیل کا ہے، یعنی ایسے رفقائے کار کی تلاش جن میں فکری ہم آہنگی ہو اور وہ اس طرح صعوباتِ سفر میں توازن قائم رکھ سکیں۔ کہنے کو تو آج ہر شخص بطور فیشن مراجعت الی القرآن (Back to the Quran) پکارتا رہتا ہے لیکن جو شخص عملاً قرآن کو سامنے لانے کی دعوت دیتا ہے اُسے سب سے بڑا ملحد اور بے دین قرار دیدیا جاتا ہے اس لئے کہ قرآن موجودہ مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، وہ مذہب جو یہود اور نصاریٰ اور مجوس وغیرہ کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ دین سے مقصود انسانی زندگی کی معاشرتی ناہمواریاں (فساد) کو دور کر کے ان کی جگہ ہمواریاں (اصلاح) پیدا کرنا تھا۔ مذہب کا کام مفاد پرستی کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو مضبوط طور پر قائم رکھنا ہے۔ دین، فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، مذہب انسانی فکر کو معطل کر دیتا ہے۔ دین، زندگی کی مستقل اقدار سامنے لا کر انسانی فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے حالات اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان مستقل اقدار کی روشنی میں اپنے لئے آپ جزئیاتِ قانون مرتب کرے۔ مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ ہم جیسے انسانوں نے سوچ لیا ہے اس سے ایک قدم اِدھر اُدھر ہٹنا جہنم میں گرنا ہے۔ دین اپنے نظام کے نتائج کو اسی دنیا میں سامنے لاتا ہے اور ان نتائج ہی کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ مذہب کی رسمیات چونکہ کوئی زندہ نتیجہ پیدا کر نہیں سکتیں، اس لئے وہ ان اعمال کو مزین بنانے کے لئے یہ دھوکا دیتا ہے کہ ان کے نتائج اس دنیا میں نہیں نکلیں گے، اگلی دنیا میں مرتب ہوں گے۔ دین زندگی کو مسلسل قرار دیتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو اپنے آغوش میں لئے رہتی ہے اور جس کی نشوونما کی ابتدا یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک برابر ساتھ چلتی ہے۔ مذہب دنیا سے نفرت سکھاتا ہے تاکہ مفاد پرست گروہ اس پر بے غل و غش قابض رہیں اور عوام رزق کے سرچشموں کو ان مستبدین کے ہاتھوں سے چھیننے کا تصور بھی نہ لا سکیں۔ دین، صرف خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے، حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اسی قانون کی اطاعت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دیتی ہے۔ مذہب اشخاص پرستی سکھاتا ہے، کہیں زندہ اشخاص کی اور کہیں مردہ کی، چونکہ عوام کی ذہنی سطح محسوسات کی خوگر ہوتی ہے اور تقلیدی اثرات سے

اس چیز کو اور بھی پختہ کر دیا جاتا ہے، اسلئے مذہب اپنی مسندوں کو برقرار رکھنے کے لئے عوام کو ہر اس دعوت کے خلاف مشتعل کرتا رہتا ہے جو انہیں شخصیت پرستی کے بجائے قانونِ خداوندی کی اطاعت کی طرف بلائے۔ اس قسم کے حالات میں جسے قرآن نے خشکی اور تری میں فساد سے تعبیر کیا ہے، خالص قانونِ خداوندی کی طرف دعوت بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔ لیکن سہل یا دشوار راستہ بہرحال یہی ہے۔ اس سفر کے پروگرام میں پہلا مرحلہ ترتیل ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، یہ مرحلہ بڑا صبر طلب ہے (صبر کے معنی استقامت ہیں)۔ عاجلہ مفاد پرستی کے پروگرام اپنے نتائج فوراً سامنے لے آتے ہیں اس لئے ایسے پروگراموں کی کامیابی بڑی آسان ہوتی ہے اگرچہ وہ رہتی بھی کچھ چندہی دن۔ لیکن مستقل اقدار کے تابع نظامِ زندگی کا قیام، اپنے نتائج بہت دیر میں سامنے لاتا ہے۔ خود اس پروگرام کے دریا دل پر غور کرو۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جیسی اولوالعزم اور بلند سیرت شخصیت ہے جو اس نظام کی طرف دعوت دیتی ہے۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا عرصۂ نبوت (آپ کی طبعی زندگی کے اعتبار سے) کل ۲۳ سال ہے۔ اس ۲۳ سال کو قیامت تک کے زمانہ تک پھیلاؤ۔ ایک ایک سانس میں صدیاں سمٹی ہوئی ملیں گی۔ اس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں سے ابتدائی ۱۳ برس کا عرصہ اسی ترتیل میں گذر گیا۔ آہستہ آہستہ، بتدریج، ایک ایک دو دو کر کے تین چار سو کے قریب رفقائے سفر میسر آئے۔ اس مرحلے میں وقت اور کوشش تو بہت صرف ہوئی لیکن جو رفقائے سفر میسر آئے۔ ان کی ایک ایک جست نے صدیوں کی مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے کر لیں۔ اس عملِ ترتیل کے دوران میں نہ کسی سے ٹکراؤ ہوتا ہے نہ تصادم، نگاہ صرف اس مقصد پر مرکوز رہتی ہے کہ انسانوں کے اس انبوہ میں سے ہر وہ فرد جس میں اس نظام کے قبول کرنے کی اور اُسے قائم رکھنے کی صلاحیت موجود ہے، وہ ان ریت کے تودوں سے الگ ہو کر اپنی طرف آجائے تاکہ (قرآن کے الفاظ میں) کوئی ایک فرد بھی نادانستہ ہلاک نہ ہونے پائے۔ دیکھو مسلیم! کتنی بڑی ذمہ داری ہے اس نظام کی طرف دعوت دینے والے پر، اسے تمام تکالیف اور مصائب نہایت ہمت سے برداشت کرنے ہوں گے تاکہ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہنے پائے جس میں اس نظام کے قبول و قیام کی صلاحیت ہو اور وہ اس وجہ سے ہلاک ہو جائے کہ اسے دوسرے انسانوں کے ہجوم سے الگ ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ ایسے صلاحیت رکھنے والے افراد کی تلاش کرنا، پھر ان کے ذہنوں میں جو غلط نقوش مستولی ہوں انہیں صاف کر کے ان کی نکھری ہوئی فطرت کو اجاگر کرنا اور اس میں کسی قسم کے جبر اور اکراہ کو کام میں نہ لانا، یہ ہے سب سے پہلا کام جس سے ترتیل لکھتے ہوئے ہیں۔ اس کا عملی طریق یہی ہے کہ خالص قرآنی فکر کو عام کیا جائے اور جو لوگ اس فکر کو اپنے اندر زندہ محسوس کریں وہ ایک مرکز پر آتے چلے جائیں۔ اس فکری ہم آہنگی کے بعد اگلا قدم ہوگا خود اس جماعت کے اندر عملی ربوبیت کا قیام اور یہی ربوبیت پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی جائے گی۔ جو مفاد پرستانہ موانع اس کے آگے بڑھنے

میں حائل ہوں گے انھیں راستہ سے ہٹانا ضروری ہوگا۔ اس ربوبیت سے جس میں ہر فرد کی انسانی صلاحیتوں کا نشوونما اس نظام کے ذمہ ہوگا، انسانیت کی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی اور ہر آنے والی نسل اپنی سابقہ نسل سے کہیں آگے ہوگی۔ تاآنکہ انسانیت خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی اور انسان کی معاشرتی زندگی اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ جسے آج روٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے اور جو ہماری موجودہ معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے وہ تو اس نظامِ ربوبیت کی تمہیدی منزل ہے جس میں رزق کے سرچشمے افراد کی بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس نظام کے ہاتھوں میں جس کی بنیاد وحدتِ خالق (یعنی مبداء قانونِ ربوبیت) اور وحدتِ خلق (یعنی وحدتِ حیات) کے غیر متبدل قانون پر ہوتی ہے۔

سلیم! تمہارے ذمہ یہ کام ہے کہ قرآن کے جس جس گوشے کو تم سمجھ چکے ہو اسے آگے پھیلاتے چلے جاؤ اور باقی حصوں کے سمجھنے میں جو جو دشواریاں پیش آئیں ان کا حل طلب کرتے رہو۔ اور اس سے مایوس مت ہو کہ مفاد پرست پارٹیاں کیا کچھ کر رہی ہیں۔

اب رہا تمہارا یہ سوال کہ خدا پر ایمان کے بغیر محض اخلاقی ضابطوں پر کسی نظام کی بنیاد کیوں نہیں رکھی جا سکتی۔ سو اس کے جواب کے لئے دوسرے خط کا انتظار کرو جس میں میں یہ بتاؤں گا کہ خدا پر ایمان کے بغیر اخلاق کا تصور ہی ناممکن ہے لیکن خدا سے مراد قرآنی خدا ہے نہ کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ بت۔ وہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکے گی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری موجودہ پستی کی وجہ ہماری کمزوریٔ ایمان ہے تو اس کا صحیح مفہوم کیا ہوتا ہے؟

اب میں تھک گیا۔ خدا حافظ۔ والسلام

پرویز

انبیائے کرامؑ

نے اپنے اپنے زمانوں میں کس طرح انقلابات برپا کئے؟

یہ تفصیل **تاریخ رسالت** میں ملاحظہ کیجئے۔

ادارہ طلوع اسلام

ایک اہم سوال

یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی مثال نہ تو دنیا کا کوئی دوسرا مذہب پیش کر سکتا ہے اور نہ عقلِ انسانی سے بنایا ہوا کوئی ضابطہ۔ ہم اس دعوے کو ایمان کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ لیکن ایک غیر مسلم کو تو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہم سے پوچھے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اسلام کے باہر نہ کسی اور مذہب میں مل سکتی ہے اور جسے نہ عقلِ انسانی مہیا کر سکتی ہے۔ غیر مسلم تو ایک طرف یہ سوال خود مسلمان نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے بھی بار بار اٹھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس دعویٰ کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس لئے کہ ہمارے دین کی ساری عمارت اسی دعویٰ کی بنیاد پر استوار ہے۔ لہٰذا اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس کا ایسا جواب مہیا کیا جائے جو ذہن اور قلب دونوں کو اطمینان دے سکے۔ ہم اربابِ فکر و نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر اپنے نتائجِ فکر سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ ان میں سے جو مضامین قابلِ اشاعت ہوں گے انھیں طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے گا اور باقی مضامین کے اہم نکات کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

اس باب میں اتنا گذارش کرنا اور بھی ضروری ہے کہ اس دعویٰ کے اثبات میں ان اخلاقی اقدار کو نہ گنایا جائے جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو مت ستاؤ، زنا سے مجتنب رہو یا غریبوں سے ہمدردی کرو، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ وغیرہ۔ نیز یہ بھی گذارش ہے کہ ان مضامین میں تفصیل طلب یا مبہم اصطلاحات سے بھی اجتناب برتا جائے۔ مثلاً اس قسم کی باتیں کہ اسلام اعمالِ صالحہ کی ترغیب دلاتا ہے، عملِ خیر کی تاکید کرتا ہے، ہوائے نفس سے مجتنب رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یا اس قسم کی باتیں مثلاً اس سے روحانی ترقی ہوتی ہے، انسان خدا کے قریب ہو جاتا ہے، اس میں معرفتِ نفس پیدا ہو جاتی ہے وغیرہ۔ اس لئے کہ یہ وہ دعوے ہیں جو دنیا کا ہر مذہب کرتا ہے۔ لہٰذا اگر ان چیزوں کو بطور دعویٰ پیش کیا جائے تو اس کے ثبوت میں ایسے واضح اور بدیہی دلائل ہونے چاہئیں جن سے یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے آجائے کہ جو نتائج اسلام کی تعلیم سے مرتب ہوتے ہیں وہ نتائج کسی اور تعلیم کے ذریعے مرتب ہونے ناممکن ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں جو کچھ کہیں ایسا واضح اور بین ہونا چاہئے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی الجھاؤ باقی نہ رہے۔

ہم شکر گزار ہوں گے اگر آپ ہماری اس درخواست پر توجہ فرمائیں۔

میری طالب العلمی

(علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مدظلہٗ)

[علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کے بصیرت افروز مقالات زینت دہ طلوعِ اسلام ہوتے رہے ہیں۔ قارئین طلوعِ اسلام میں سے اکثر نے یہ لکھا کہ حضرت علامہ کی ذات سے زیادہ تعارف کے لئے ان کی زندگی کے حالات بھی شائع کئے جائیں۔ حضرت علامہ سے اسوقت ان کے کوائف حیات سے متعلق معلومات حاصل کرنا دشوار تھا کیونکہ آپ ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔ لیکن حسنِ اتفاق کہ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں "اپنے زمانۂ طالب العلمی کے تاثرات" کو قلمبند فرمایا تھا۔ ان تاثرات میں آپ کی زندگی کے ابھرے ہوئے خدوخال سامنے آجاتے ہیں۔ قارئین طلوعِ اسلام کی تشنگیٔ ذوق کی سیرابی کے لئے ہم ان تاثرات کو بمسرت شائع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ طلوعِ اسلام شخصیت پرستی نہیں سکھاتا بلکہ حقائق پرستی کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اس میں اگر کسی شخص کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کی شخصیت کو نمایاں کیا جائے بلکہ اس سے بھی مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں حقائق طلبی کیلئے سعی و کاوش کے جو پہلو مضمر ہیں انھیں سامنے لایا جائے تاکہ اس سے جویانِ حقیقت کو اپنی راہوں میں آسانیوں کے نشان مل سکیں۔ خود علامہ موصوف نے بھی ان تاثرات کو اس مقصد کے پیشِ نظر قلمبند فرمایا تھا۔ طلوعِ اسلام]

مجھے اپنی طالب العلمی کے حالات کو منظرِ عام پر لانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہلِ حدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترکِ تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سراسر ذہنی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہلِ علم کو تقلیدِ شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لئے علمی کوشش شروع کی۔ کیونکہ اس ماحول میں جبکہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر مسلمان تلواریں کھینچکر ان کو قتل کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا سخت دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علما میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہانتک کہ ان کے پوتے مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ

سکے زمانہ میں خالص کتاب و سنت کی حامل ایک جماعت تیار ہوگئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انھوں نے پوری توجہ اظہار کلمۃ الحق میں صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقا کے لئے علماء اہل حدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین عرف "میاں صاحب" خاص طور پر ممتاز ہیں۔ انھوں نے دہلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ ان کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علماء حدیث پھیل گئے جنھوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب سنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا۔ میاں صاحب کے آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے اس تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہیدؒ کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کیلئے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو "محمدی" کہنے لگے۔ پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہؒ سے ہوا۔ پھر مولانا شہیدؒ نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلویؒ کو بنایا۔ اس کے بعد صادقپوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوششوں سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا کام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خاں کی ذات اور نواب شاہجہاں بیگم کی علمی قدردانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ نیز اقطاع ہند میں جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب و سنت کی اشاعت کرتے تھے ان میں اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصہ سے اس جماعت کے اہل علم کی وہاں آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف کی شہرت کی وجہ سے عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔

میرے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم علماء بھوپال میں سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو ۱۳۰۷ھ میں ہوا بیرون ہند کے علماء کی آمد کا سلسلہ تو بہت کچھ بند ہو گیا تھا لیکن ہندوستان کے اہل علم شاہجہاں بیگم کے عہد ۱۳۱۹ھ تک آتے رہے کیونکہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری تھا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی امیرانہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علماء کا گذر مشکل تھا اس لئے وہ لوگ اکثر والد ہی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانہ میں ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے مہتمم تھے اور واعظ شہر۔ سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کیلئے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر کے معزز ترین حصہ میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے۔

اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء اہلِ حدیث کا مرجع تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان بزرگوں کی خدمت میں رہا۔ اس وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔

بھوپال میں میری طالب العلمی کا زمانہ ۱۳۰۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۹ھ میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شاہجہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا جن کی دینداری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوشحالی نمایاں تھی اور علم دین کا چرچا عام تھا۔ اس دراز مدت میں بہت سے علماء و فضلاء کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا، اب کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انھیں کو لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی طالب العلمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

آغاز میری ولادت میرے وطن موضع جیراجپور ضلع اعظم گڈھ میں ۱۲۹۹ھ میں ۷ ربیع الاول یوم جمعہ کو ہوئی۔ اس وقت میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے۔ حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علماء اہلِ حدیث تھے، جن میں مولانا عبداللہ صاحب جیراجپوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری بھی تھے۔ ان لوگوں نے علماء حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔

وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں بلا کر مدرسہ وقفیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہو گئے۔ پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی مہتمم مدرسہ مذکورہ کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ وہ ہر سال کنوار کی تعطیل میں ایک ماہ کیلئے وطن آیا کرتے تھے۔ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازے پر تھا۔ اس میں ایک میاں جی مولوی شکر اللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے تھے، ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسی لٹکائے رکھتے جس میں قصوروار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر ان کی پیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے۔ لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لئے آپ کے سپرد کرتا ہوں، اس کے ساتھ سختی نہ کیجئے گا۔ چنانچہ انھوں نے مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور وہی برتاؤ رکھا جس کی والد نے ان کو ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب میں جاتا تو مجھے سبق دیتے اور کہہ دیتے کہ جس وقت یاد کر کے سنا دوگے اس وقت چھٹی مل جائے گی۔ اس میں مجھے بڑی آسانی ہوئی

محنت کر کے تھوڑی دیر میں یاد کر لیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دیدیتے تھے۔ سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے میں نے ختم کئے۔ دوسرے سال جب والد تعطیل میں مکان پر آئے تو مجھ کو مع میری والدہ کے بھوپال لائے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبدالاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے مگر والد نے ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی تھی ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے، وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ جب میں بھوپال میں آیا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظ قرآن میں لگا دیا۔

حفظِ قرآن

والد کے پیشکار سید مظہر حسین مرحوم بڑے متقی، باوضع اور جید حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسہ میں جا کر ان سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ جو پنجاب کے رہنے والے تھے صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور آموختہ سننے کے لئے ملازم تھے، ان کا نام عبدالکریم تھا لیکن حافظ "مینو" کہے جاتے تھے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے پنجابی میں ایک شعر گا رہے تھے جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا

مینو تینو کہن دہائی اسوچ کی بُرائی

اسی دن سے ان کا لقب مینو پڑ گیا اور سب اسی نام سے ان کو پکارنے لگے یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعد قرأت سے واقفیت رکھتے تھے۔

والد نے ہمارے لئے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطہ کے اور کوئی غلطی نہیں ہے یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں ہوتا ہے جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا ہم ہر مہینہ میں آسانی سے ڈیڑھ بلکہ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے۔ روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی دن بھر آزادی۔ عبدالاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والدہ نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا سبق ہمارے مختلف منزلوں سے ہوتے تھے باوجودیکہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے تھے، میرے ختم قرآن کے دن اُن کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے جن میں سے تقریباً تین مہینے بیماری میں گزرے۔

یہ بیماری تپ محرقہ کی تھی حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سر شام ہی سے بالکل ہوش جاتا رہا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے۔ پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جبکہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے ہوئے تھے میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل ہی سے لوٹا

پھر یہی تھیں کہ سیڑھیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا کہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ والد الٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دعا مانگی تھی یہ خبر سنائی۔ پھر گھر میں آئے۔ میں بشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننہیال خاندان بھی بھوپال ہی میں ہے، بچپن سے مجھکو میری نانی اور نانا نے پرورش کیا تھا اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس نہ تھا اور بھوپال آنے پران کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا۔ والدہ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ دیکھو ایسی کوئی بات نہ کرنا، جس سے تمہارے حق میں تمہارے ابا کی زبان سے کوئی برا کلمہ نکل جائے کیونکہ اللہ اُن کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا ہماری بات نہیں سنتا۔ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے مگر ان کی جلد مان لیتا ہے جو اُس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً ٹھیک وہی وقت تھا جبکہ والد ادھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ ادھر اللہ نے مجھ کو دوبارہ زندہ کر دیا اس لئے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آگیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کر دینے کی منت مانی تھی۔ صبح کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے حوالہ کر دی، انھوں نے اس کو طلباء کے مصرف کے لئے ابراہیم پورہ[1] کی مسجد میں بھیج دیا۔ والدہ نے اس کے بعد پھر کبھی چاندی کا ایک چھلا بھی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیث نعمت الٰہی کے یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک کہ تقریباً پچاس سال ہو گئے اور مجھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت ہی میں رہنا پڑا کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت ہو جاتی ہے تو رو اگر تا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والدہ کو لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاکیہ میرے گاؤں میں جاتا ہے اسی دن شفا کی امید رکھتا ہوں کیونکہ جہاں خط پہنچا والدہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور ادھر میں اچھا ہوا۔

---

[1] یہ کٹیرہ وسط شہر میں واقع ہے جس میں اس زمانہ میں چالیس پچاس طالب علم رہتے تھے۔ ان میں سے اکثروں کو ۲۵ سیر گیہوں ماہانہ سرکار سے ملتے تھے باقیوں کے لئے دیگر وظائف کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ وہ زمانہ چونکہ بھوپال میں عام خوشحالی کا تھا اس وجہ سے اکثر بلکہ روزانہ شادی، غمی، تیجا، چہلم وغیرہ کی دعوتیں ان طلبا کو نصیب ہوتی تھیں اور ان کی پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں تر رہتی تھیں۔ یہ مشہور تھا کہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں ایک چٹائی کی جگہ ایک اقلیم کے تخت کے برابر ہے۔ میں نے ایسی مثالیں بھی دیکھیں کہ لوگ یہاں سے پڑھ کر اپنے وطن واپس گئے ایک مدت کے بعد پھر جب بھوپال کا پلاؤ زردہ یاد آیا دوبارہ آکر داخل ہو گئے۔ اس میں ایسے طلبا بھی تھے جن کو اپنے داخلہ کی تاریخ بھی یاد نہ تھی اور جن کی عمر یں چالیس سال سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ صرف بھوپال ہی کا حال نہیں بلکہ تمام اقطاع ہند میں عربی خواں طلبہ کے گزارہ کی شکل بیشتر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و فضل حاصل کر لینے کے بعد بھی بالعموم فاقہ، طبع اور پست خیالی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

حفظِ قرآن کے بعد رمضان شریف میں صرف چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سنانا تھا اس وجہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیئے اور خوب رواں کر لیا بالآخر [illegible] میں جبکہ میری عمر کا نواں سال تھا میں نے پہلی محراب سنائی۔ روزانہ ایک ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا لیکن دن بھر اس کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سنا لیتا تھا میری قرأت قواعد کے مطابق اور صاف تھی اس وجہ سے لوگ پسند کرتے تھے اور اہلِ حدیث دور دراز محلوں سے سننے کے لئے آتے تھے۔ شبِ قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لئے متعین ہوئی، اس دن مسجد آراستہ کی گئی، والد نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے آئے اور کچھ روپے بھی جو اُن حافظ صاحب کو دیئے گئے جنھوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سنا تھا۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل ہوئی ہے۔

شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتہ اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا اب تک مجھ کو افسوس کرتے کا رنگ اور بوٹے یاد ہیں۔ اسوقت مجھ میں عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہنِ یوسف کی طرح زندگی بھر کیلئے محفوظ رکھ لیتا۔

دوسرے دن صبح کو والد نے ایک نہایت قیمتی زریں دوشالہ جو ان کو اسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپے رکھ کر مجھے حکم دیا کہ اپنے استاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لیجا کر پیش کرو۔ ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا۔ حافظ صاحب موصوف نے خوش ہو کر اپنا متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک میں دیکھ رہا ہوں۔

فارسی حفظِ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانے میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ گلستاں اور بوستاں دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ہر جمعرات کو اُن کے ایک ایک باب کا آموختہ کھڑے ہو کر زبانی سنایا کرتے تھے قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعدِ سلیمہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جز کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔ اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاعر[1] کے دو رسالے پنج سبق اور

---

[1] مولانا احسن صاحب بلگرامی اپنے فن کے ایک ہی شخص تھے۔ انھوں نے ایک نقشۂ الف ترتیب دیا ہے جس سے ہر شخص بلا غور و فکر کی زحمت کے فارسی اور اردو شعر کہہ سکتا ہے یا اشعار کا جواب اتار سکتا ہے۔ بھوپال میں یہ مشہور تھا کہ مولوی احسن کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

وہ سبق معہ تحریری مشق کے پڑھے جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آگیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آبحیات کے قصہ میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے؟ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آبِ حیات سے معانی۔ جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں سے آبِ حیات لاتا ہے اور یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر استاد کا محتاج ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے جیسے سکندر کہ خضر کی رہنمائی سے بھی آبِ حیواں اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی، اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھ لیا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہو گئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں مثلاً شاہنامہ فردوسی و دواوین اساتذہ و مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

اس زمانہ میں بھوپال میں فارسی کا چرچا عام تھا، میں اس میں شعر بھی کہنے لگا تھا مگر والد کو جب علم ہوا تو انھوں نے تضیع اوقات کے خیال سے منع کر دیا۔ فارسی کا کل مرحلہ چار سال کے اندر ہی ختم ہو گیا، اس کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔

ریاضی

حساب، اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لئے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی داں تھے مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آکر تعلیم دیتے تھے ایک دن انھوں نے امتحان لیا، کسر ملتف کا سوال تھا سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا۔ انھوں نے سلیٹ کو دیکھا اور الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میرے اور ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں، وہ ان کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے۔ جب سب کے جوابات آگئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا بے ساختہ ایک طمانچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا اس لئے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا۔ جب انھوں نے اطمینان سے جوابات دیکھے تو کسی کا عمل غلط تھا اور کسی کا جواب لیکن میرا جواب اور عمل دونوں ٹھیک نکلے۔ میں نے پوچھا کہ کیا غلطی ہوئی؟ کچھ نہیں بولے۔ میں اٹھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے سخت رنج تھا کیونکہ میں ہر استاد کی عظمت کا لحاظ رکھتا تھا اور اس کے ہر حکم پر اس کی منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کسی استاد کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور ان کی طرف سے بھی سوائے شفقت اور محبت کے کوئی دوسری بات نہیں دیکھی۔ اس لئے

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) تو وہ شاعر ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا لقب شاعر گر تھا۔ ان کا یہ نقشہ اب بھی میرے پاس ہے لیکن مرموز ہے جس کو حل کرنے والا ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بھوپال کا سفر اسی لئے میں نے کیا تھا مگر اس وقت وہاں ان کا کوئی شاگرد جس نے ان سے یہ نقشہ پڑھا ہو نہیں مل سکا۔

اس واقعہ سے نہ صرف میری عزتِ نفس بلکہ اس اعتماد کو بھی صدمہ پہنچا جو میں استادوں پر رکھتا تھا۔ اگرچہ تسلی کیلئے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات ہی کیوں پیش آئی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقعہ کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کیلئے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی محمد اکبر خانصاحب جو مدرسہ جہانگیری میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔

میرے نزدیک استاد اور شاگرد کا تعلق دماغی ہے، نہ بیٹے اور باپ کا سا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا سا۔ بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود استاد پر لازم ہے کیونکہ استاد کی ذرا سی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لئے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کیلئے اسی وقت میں آنے لگے۔

صرف ونحو ان کی تعلیم میں کتابوں کے بجائے اصل فن کے سکھانے پر نظر رکھی گئی۔ طریقہ یہ تھا کہ مولوی فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آجاتے۔ ان کے مواجہ میں والد مجھے حکم دیتے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے اس کو بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا۔ کھڑے ہو کر سنا دیتا۔ اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دیتا۔ ہر مہینہ کے آخر میں اس مہینہ کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی۔ یہ سلسلہ فصولِ اکبری اور کافیہ تک رہا جو زبان یاد کرائی گئی تھیں۔

بھوپال میں اس وقت صرف ونحو کے اچھے استاد تھے۔ جب ان میں سے کوئی ہمارے یہاں آتا تو امتحان لینا میرے ساتھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیونکہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار رہتا تھا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی۔ میں اپنا سبق مطالعہ کر کے ایسا تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات کے سمجھنے یا پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ اُن کو یہ بات معلوم تھی اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ سے ہی کراتے تھے۔ تکرار[1] میں میں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بارہا شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انھوں نے خود کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر سبٹ ان کو مستحضر تھی، اس کے اعتراضات کرتے تھے مگر وہ کتاب

---

[1] یہ طلباء کا اصطلاحی لفظ ہے۔ استاد سے سبق پڑھ لینے کے بعد جماعت الگ بیٹھکر اسی سبق کو آپس میں مل کر دہراتی تھی اسی کا نام تکرار تھا۔ یہ اس زمانہ میں عام تھا اور بالخصوص ہماری تعلیم میں لازمی قرار دیا گیا تھا۔

میرے پاس بھی تھی اس لئے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

فقہ واصول مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف ونحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے اسی طرح فقہ اور اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انہی کے سپرد کی۔ اہلحدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کیلئے دی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔

ایک بار قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ شرح وقایہ۔ پھر پوچھا کہ حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ تمہارے والد بہت دانشمند ہیں وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے۔

اصول فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب یہ شکایت سنی تو غزالیؒ کی "المستصفیٰ" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب حجب کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو ان سے زیادہ مجھ کو قلق ہوا میرا دل مطلقاً قبول نہیں کر سکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے لیکن جسقدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث وعلماء سلف کو متفق پایا۔ اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو، مگر دل میں یہ خلش برابر رہی۔ الحمدللہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ آخر میں خواجہ احمدالدینؒ صاحب امرتسری کے رسائل سے جو انھوں نے اس مسئلہ پر لکھے تھے مجھے مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے اہلِ علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہلِ فتویٰ ہیں ان سے تحریری مناظرے کئے مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے، اسوقت رسالہ محجوب الارث لکھ کر شائع کیا جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں متعدد بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمدالدین صاحبؒ نے اپنے رسالہ معجزۂ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو علمی شکل میں ترتیب دیکر عربی زبان میں "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔

منطق وفلسفہ والد نے خود صغریٰ کبریٰ وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے، پھر تہذیب زبانی یاد کرائی اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایت الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی۔ روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے یہاں ہوتے تھے اور دو سبق منطق وفلسفہ کے۔ والد کے یہاں مطولات میں پہنچکر صرف تین سبق روزانہ رہ گئے جن کو والد خود ہی

پڑھاتے تھے۔ صدرا اور شمس بازغہ تک یہی سلسلہ رہا۔ ہیئت میں تصریح اور شرح چغمینی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

ادب

والد نے پہلے زمخشری کی اطواق الذہب حفظ کرائی، پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھیں لیکن والد کو ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ و بعض دیگر اشعار کا ایک مختصر مجموعہ والد نے تیار کیا تھا۔ اس کو ہم سب نے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا۔ پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا۔ حریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان متنبی و حماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیئے تھے پڑھے۔

حکیم معز الدین خاں صاحب سابق افسر الاطباء بھوپال نے مطول محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوایا تھا جس زمانہ میں میں اس کتاب کو شروع کرنے والا تھا انھوں نے ایک نسخہ والد کے لئے اور ایک نسخہ خاص میرے لئے بھیج دیا۔ اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا تھا آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی ہی زبان میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتہ میں ایک قصہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ مطالعہ کے لئے واقدی کی فتوح الشام اور الف لیلہ کی جلدیں ملیں جن کو میں نے چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا پھر محاضرات اور تراجم ادبا کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

حدیث

سب سے پہلے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے رسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا اور جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ ہیں سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام مالکؒ، اصول حدیث میں نخبہ و دیگر رسائل سے جملہ اقسام حدیث اور اس کے علل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے۔ آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی ایک کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث کے جگت استاد تھے، مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے وہ لیاقت پیدا کرانی چاہتے تھے۔

قرآن

والد نے کہا کہ میں قرآن پڑھاؤں گا۔ تم میں سے ہر ایک اپنے لئے ایک ایک الگ الگ تفسیر منتخب کرے اور سبق اسی سے تیار کر کے لائے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق توقیر الکریم نے جن یا کشاف کو عبدالغفور نے لیا۔ میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائمی کی تبصیر الرحمٰن رکھی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور دوں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کسی نے بیضاوی کو کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو۔ والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی، میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹہ میں ہوتا تھا۔ ہر آیت بلکہ ہر لفظ کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔

درسی نصاب جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے تھے ان کی غرض و غایت فنی حیثیت سے اگرچہ بیان کر دی جاتی تھی مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ ان کے جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں اس لئے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسان کے لئے شرف ہے۔ اسوقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری یا مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اسوقت بھی کھٹکتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں وہ تقریباً تمام کی تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور لاطائل بحثیں بھری ہوئی ہیں۔ میں سوچا تھا کہ خود متون مثلاً شمسیہ، سلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور ان شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ مگر جب ان متون پر غور کیا تو اس قدر مغلق نظر آئے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوئے کیونکہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیئے جائیں خواہ وہ معما ہی کیوں نہ بن جائیں۔ شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانہ میں میں نے ایک طالب علمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:-

چیستاں سُلّم، مسلّم سربسر ابہام ہے — کچھ عبارت سے نہ حلِّ عقدۂ باطن ہوا
ہو سکے شرحوں سے شرحِ صدر کی امید کیا — شارحوں میں بحثِ لفظی کا مرض مزمن ہوا
ایک کا اجمال مہمل ایک کی تفصیل لغو — علم تھا جتنا وہ نذرِ شارح و ماتن ہوا

بیشک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متن متین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مصنف نے نہ معلوم کس دقتِ نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم و کاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھا یا گھٹا یا یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوئی ہیں جن سے اس کے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں کیونکہ یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیئت وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ میری طبیعت میں کچھ تو فطرتاً تنقید کا مادہ ہے اور کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو ہر شے پر تم کو تنقید کا پورا

حق حاصل ہے۔ اس لئے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا ان پر اعتراض کرتا تھا۔ میرے استاد اس رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شرح عقائد نسفی پڑھتے وقت میں نے ملا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انھوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے باوجود اس کے ان کی مدافعت نہیں کر سکے ان کو اعتراض سے بالاتر قرار دیا اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر مجھے خاموش کر دیا۔

خیالات خیالی بس بلند است　　　درانجا جائے قل احمد نہ جندا است[1]

ولے عبدالحکیم خوش خصالی　　　کہ حل کردہ خیالات خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر مقلد کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من حیث القوم صدیوں سے ماضی پرستی میں مبتلا ہیں۔ ان کی مثال مکہ کے اس نانبائی کی ہے جو باسی روٹی کو تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہد رسالت سے ایک رات قریب تر ہے اس لئے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر پوچھئے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کوسوں بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کلی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیئے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے امید ہے کہ امت میں جس دن مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پا سکے گا۔

تربیت والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو۔ کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی بار اُن کی زبان سے سنا:

طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِلدُّنْیَا لٰکِنْ اَبَی الْعِلْمُ اَنْ یَّکُوْنَ اِلَّا لِلّٰہِ

صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ تاکید رکھتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہم نے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے پڑھائی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اس میں دن بھر ہیں اور

---

[1] مولانا جندا اور قل یا احمد خیالی کے دو حاشیہ نگاروں کے نام ہیں۔

میرے دس بارہ ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی اور نہ وہاں کوئی بجز اہل علم یعنی علماء وطلباء کے آتا جاتا تھا۔ والد بھی اس میں بیٹھا کرتے تھے۔ در اکثر اسی جگہ پڑھاتے بھی تھے۔ وہ ہمیشہ خوش باش رہتے تھے اور ایسا ہی ہم کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی محبت اور عظمت کا گھر بھر پر اس قدر اثر چھایا ہوا تھا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی، اگر احیاناً کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو متنبہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ کہ غصہ سے۔

ایک بار رسالہ کے دو افسر ملنے کے لئے آئے۔ جب اوپر آ کر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نیچے اترا اور ان کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل میں ہمارے بالمقابل رہتے تھے چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوشنما چمن لگایا گیا تھا۔ اسی سڑک پر میں نے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دو چکر دیئے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہوگی اور یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ کون ہے۔ جب میں اوپر آیا تو اپنے قریب بلا کر یہ جملہ فرمایا جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔

إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ

بھوپال میں اس زمانہ میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیز گار تھے روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے۔ شہر کے لوگ دور دور سے اس میں شریک ہوتے تھے۔ والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب نے ان کے ترجمہ کی تعریف کی اور اسی کے ساتھ ان کی علمیت کی بھی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقولی نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا، اس وجہ سے بیساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ ان کو علم سے کیا واسطہ۔ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا:۔

وَمَا عَبَّرَ الْإِنْسَانُ عَنْ فَضْلِ نَفْسِهِ ۔۔۔ بِمِثْلِ اعْتِقَادِ الْفَضْلِ فِي كُلِّ فَاضِلٍ

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے، والد مغرب کی جماعت پڑھ کر آ گئے۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین ہیں کہ جماعت کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بیجا تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ یکساں تھا خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفریق جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اوپر والد کے کمرہ کے بازو میں تھا۔ گرمیوں میں جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے تو میں ان کی دعائیں سنتا تھا۔ دین اور دنیا کی کونسی خوبی تھی جس کو میرے ملئے نہیں مانگتے تھے۔

خاصکر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دیکر الحاح وزاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے اس وقت فرطِ رقت سے بستر میں پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسو کے قطرے تکیہ پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا اس لئے میں جانتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا میں میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف جسمی نہیں بلکہ روحی بھی ہے۔

انھوں نے ہمارے لئے ایک استاد بھی مقرر کردیا تھا جو روزانہ شام کو آکر رانگ، بالا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہوجاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی جب ریاست کے دورہ میں کبھی والد کے ساتھ ہوتا تھا۔

عرب والد کو عربوں کے ساتھ بہت محبت تھی، وہ ہمیشہ ایک نہ ایک عرب خواہ بطور طالب علم خواہ بطور مہمان اپنے یہاں رکھا کرتے تھے۔ جب ہم نے عربی شروع کی تھی اس وقت نجد کے ایک جوان صالح علی بن ناضی ہمارے یہاں رہتے تھے جو نہایت مستعد طالب علم تھے۔ والد کا صحیح بخاری کا درس مشہور تھا جس دور میں علی بن ناضی تھے وہ یادگار دور تھا۔ اس میں اچھے اچھے مشہور اہلِ علم شریک تھے مثلاً مولوی عبدالحمید بنگالی لبستی کے مولانا ریاست اللہ، بہار کے مولانا حسرت علی، ٹونک کے سید محمد عرفان وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ناحیہ کا مقتدا تھا۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کی عمریں خود والد سے زیادہ تھیں۔ یہ لوگ ۱۶۔ ۱۷ آدمی تھے، جس وقت سبق کے لئے بیٹھتے والد کا کمرہ داڑھیوں سے بھر جاتا۔ انھیں میں مولانا افضل تھے جن کی حنائی داڑھی اس قدر بڑی اور گھنی تھی کہ آج تک میری آنکھوں نے ایسی داڑھی نہیں دیکھی۔ یہ جہانگیر آباد میں رہتے تھے جو ہمارے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں سے روزانہ دوپہر کے وقت آتے تھے۔

لطیفہ اسی زمانہ میں بھوپال میں ایک حافظ صاحب تھے جن کی ڈاڑھی مولانا افضل سے دوئم درجہ کی سمجھی جاتی تھی، وہ چونکہ نقوش، تعویذات اور عملیات کا پیشہ رکھتے تھے جس میں یہ شے بہت کارآمد ہوتی ہے اس وجہ سے مختلف روغن استعمال کرکے اس کو اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا افضل کا انتقال ہوگیا تو چند زندہ دل حافظ صاحب کے پاس پہنچے اور ان کو اس بات کی مبارکباد دی کہ اب آپ کی داڑھی شہر بھر میں بے نظیر ہوگئی۔

علی بن ناضی حدیث ختم کرکے نجد چلے گئے۔ والد کی زندگی تک علمائے نجد کی تصنیفات جہاں کہیں بھی چھپتی تھیں بھابر بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مکہ کے ایک بزرگ عرب جو شریف صاحب بولے جاتے تھے کئی سال ہمارے یہاں مہمان رہے بڑے جہاندیدہ اور خوش طبع تھے۔ دن بھر ان کا سماوار گرم رہتا تھا، عربی کتابی اور فصیح بولتے تھے مجھ سے فارسی بھی سیکھ لی اور چند مہینوں میں اس میں بھی گفتگو کرنے لگے۔ آخر میں عبداللہ آیا، یہ ایک نجدی نوجوان تھا نہایت وحشی مگر بے حد محبتی۔ اردو ایک حرف نہیں جانتا تھا۔ اس کو حجرہ موتی مسجد میں دلا دیا گیا تھا لیکن ہر شخص سے لڑتا تھا

اس لئے دن بھر میرے ہی پاس رہتا تھا۔

عاشورہ کے دن کہنے لگا کہ میلا دیکھنے چلو۔ میں نے سمجھایا کہ یہ مشرکانہ رسم ہے جس میں شریک ہونا گناہ ہے پھر میرے والد واعظ شہر اور موحدوں کے سرگروہ ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ میں نے بھی یہ میلا کبھی دیکھا نہیں تھا اس کو ساتھ لیکر چلا گیا۔ خیال تھا کہ والد کو خبر نہ ہو سکے گی مگر دوسرے دن کسی نے کہدیا۔ مجھے بلایا اور پوچھا کہ کل تم کربلا میں گئے تھے؟ یہ سوال ایسا اچانک تھا کہ میں نہ اس کے سننے کے لئے تیار تھا نہ جواب دینے کے لئے۔ خاموش کھڑا رہا۔ وہ تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے بولو۔ میں نے کہا کہ اگر میں اپنی آنکھوں سے ایسے مقامات کو نہ دیکھوں گا تو ان میں جو خرابیاں ہوتی ہیں ان کا علم مجھے کیونکر ہوگا۔ یہ جواب سنتے ہی ان کے چہرہ سے عتاب کا رنگ جاتا رہا اب صرف یہ شکایت رہ گئی کہ زرین ٹوپی لگا کر اور ہاتھی پر سوار ہو کر میلے میں جانا خود اپنی نمائش ہے اور علم کی اہانت۔

ہم سبق حفظِ قرآن کے بعد میرے خاندان کے دو تین لڑکے بھوپال میں آ گئے تھے جو میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب میں نے عربی شروع کی اس وقت بعض اعیان و امراء بھوپال یہ سوچ کر کہ مولانا اپنے اکلوتے بیٹے کو خاص توجہ کے ساتھ پڑھائیں گے اپنے بیٹوں کو میرے ساتھ پڑھنے کے لئے بھیجنے لگے۔ قطبی اور میر قطبی تک ۱۷-۱۸ ہم سبق ہو گئے دن بھر ہمارا مدرسہ خوب آباد رہتا تھا مگر پھر یہ تعداد گھٹ گئی کیونکہ ہم ذہنی زندگی کی گہرائیوں میں اس قدر گھس گئے تھے کہ مطالعہ اور سبق، تکرار اور بحث ہمارے لئے دماغی آسائش کی چیزیں بن گئی تھیں۔ اسلئے یہ نازوں کے پالے جن کی علمی بنیادیں بھی کمزور تھیں ہمارے ساتھ کیسے چل سکتے تھے مگر ان سے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے وہ برابر قائم رہے۔

میرے ساتھیوں میں سے دو شخص صحیح معنوں میں طالب علم اور سچے رفیق تھے ان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

عبدالغفور یہ کشمیر کے رہنے والے ۲۲-۲۳ سال کے نوجوان تھے۔ مختلف شہروں سے تحصیل علم کرتے ہوئے بھوپال آئے اور ہمارے ساتھ مقاماتِ حریری میں شریک ہوئے۔ اُن کو ادب کے ساتھ خاص ذوق تھا۔ جاہلی شعراء سے لیکر متاخرین تک کے چیدہ چیدہ ہزاروں اشعار، سینکڑوں لطائف اور نکات ازبر تھے۔ یہی حال فارسی میں بھی تھا۔ اُن کی وجہ سے میرے ادبی ذوق میں بہت ترقی ہوئی۔

اس زمانہ میں ٹونک کے ایک نامور ادیب مولوی محمد صاحب اعرج ہمارے قرب میں رہتے تھے، وہ اپنے وقت کے حماد الراویہ تھے۔ عربی کا کوئی پسندیدہ کلام تھا جو اُن کو یاد نہ تھا۔ خود بھی بے تکلف عربی نظمیں اور قصیدے لکھتے تھے۔ ہم دونوں اکثر ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتے۔ عبدالغفور کی آواز اچھی تھی اور شعر پڑھنے کا انداز دلکش، روح کی پوری حدت صرف کر دیتے تھے، چہرے پر پسینے کے قطرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کی بوندیں۔ میں نے

ایک بار شیخ ابن الفارض کا قصیدہ تائیہ خمریہ جو مجھے بہت پسند ہے اُن سے پڑھوا کر سُنا، بیحد لطف آیا۔ خاصکر اس شعر پر پہنچکر تو وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

لَهَا صَلَوَاتِي بِالْمَقَامِ أُقِيمُهَا وَأَشْهَدُ فِيهَا أَنَّهَا لِي صَلَّتِ

چند روز بعد عبد الغفور خود اسی وزن اور قافیہ میں ۶-۷ شعروں کا قصیدہ لکھکر لائے اور سنایا، میں غور سے سنتا رہا کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ خوش ہوکر اُن سے کہا کہ لاؤ وہ ہاتھ دو جس سے اس کو لکھا ہے تاکہ چوم لوں۔ انھوں نے آخر میں میرا بھی ذکر کیا تھا اور جوش میں یہانتک کہہ گئے تھے کہ

فَيَا لَيْتَنِي يَوْمًا أَكُونُ كَمِثْلِهِ وَيَا لَيْتَنِي يَوْمًا أَكُونُ مُنْيَتِي

اس لئے میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر یہ اشعار لکھ دیئے:-

مُحَيَّاكَ يَا عَبْدَ الْغَفُورِ مَسَرَّتِي وَلُقْيَاكَ رَيْحَانِي وَرَوْحِي وَجَنَّتِي

وَصَوْتُكَ فِي سَمْعِي كَأَطْرَبِ نَغْمَةٍ وَشِعْرُكَ فِي قَلْبِي كَأَطْيَبِ لَذَّةٍ

وَأَخْلَاقُكَ رَوْضٌ مِنْ رِيَاضٍ لَطِيفَةٍ وَحُسْنُكَ مِنْ آلَاءِ رَبِّ الْبَرِيَّةِ

فَفِي أَيِّ شَيْءٍ خِلْتَنِي مِثْلَكَ فَأَيْنَمَا وَفِي أَيِّ وَصْفٍ انْتَصَبْتَ بِغِبْطَتِي

توقیر الحسن دوسرے ہم سبق جن کی محبت سے میرا دل لبریز ہے توقیر الحسن تھے۔ یہ بہار کے رہنے والے تھے جہاں کا پانی چالیس دن اگر کوئی غبی بھی پی لے تو ذہین ہو جائے۔ مولوی عبد الوہاب صاحب بہاری دکن سے اپنے وطن جاتے ہوئے جب بھوپال میں ٹھہرے تھے تو ان کے ساتھ چند طالب علم بھی تھے جن میں سے توقیر کو قسمت نے ہمارے لئے چن لیا یہ بھوپال ہی میں رہ گئے اور بہایہ وحمد اللہ میں ہمارے ساتھ ہوگئے۔ دبلے، دراز قد، نہ جسیم نہ صورت مگر دل اور دماغ ایسا کہ کمتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ابراہیم پورہ کی مسجد میں مقیم تھے مگر صبح سے شام تک میرے ہی پاس رہتے تھے۔ روزانہ علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی اور جمعہ کا دن تو اس کے لئے مخصوص تھا۔ ہم نے رشیدیہ میں مناظرے کے جو اصول پڑھے تھے انھیں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس لئے ہماری بحثیں در اصل مل جل کر کسی مسئلہ کی تحقیق کے مرادف تھیں اور جدل و مکابرہ سے یکسر خالی جس سے باہمی محبت میں فرق نہیں آتا۔

ایک بار مجھے صدر کی شکایت تھی، توقیر ملنے کے لئے اوپر آئے۔ ڈاکٹر ولی محمد نے جو میرے معالج تھے "وائن آف کاڈ لور آئل" کی شیشی استعمال کے لئے دی تھی، اس سے مجھے نمایاں فائدہ تھا۔ توقیر نے جب اس کو دیکھا تو کہا کہ یہ شراب ہے حرام، جس میں کوئی نفع نہیں۔ میں نے کہا کہ کتابیں دیکھنے کے بعد اس کی حرمت ثابت کرنا۔ جمعہ کے دن جب بحث ہوئی تو ہم

کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ دوسرے جمعہ کو ایک مولانا صاحب حَکَم مانے گئے۔ انھوں نے فریقین کی تقریریں سنکر میرے دلائل کو قوی بتایا۔ مجھے خوشی تو ہوئی مگر معاً دل میں یہ اضطراب پیدا ہوا کہ توقیر کو رنج نہ پہنچا ہو کیونکہ میں نے تیمور کے سامنے سید شریف اور علامہ تفتازانی کی بحث کا حال سنا تھا کہ کسی درباری نے کہدیا کہ سید کی تقریر چست تھی۔ اس صدمہ سے علامہ تفتازانی صاحب فراش ہوگئے لیکن جس وقت ہم کمرہ سے نکلنے لگے تو توقیر نے مسکرا کر کہا کہ دراصل جو پہلو میں نے اختیار کیا تھا وہ کمزور تھا۔ یہ سنکر میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔ خوش ہوکر ان سے لپٹ گیا اور کہا کہ تم کس قدر حق شناس ہو، تمہاری انصاف پسندی پر مجھ کو رشک آتا ہے۔

ایک دن مولوی محمد بشیر صاحب والد سے ملنے آئے۔ ہم لوگ بھی جاکر ان کے پاس بیٹھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے فرمایا کہ طالب العلمی کے زمانہ میں میں اور میرے ایک ہم سبق تقلید شخصی کے متعلق بحث کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ وہ جائز نہیں ہوسکتی۔ کوئی عالم خود یا اپنے دو چار شاگردوں یا رفیقوں کو لیکر اگر اپنے حجرہ میں رائے اور قیاس سے ایک فقہ مرتب کردے تو وہ امت کے لئے دائمی شرعی قانون کیسے بن سکتی ہے۔ یہ شرک فی النبوۃ ہی نہیں بلکہ شرک باللہ ہے کہ کسی غیر ما مور کا قول بلا دلیل اس طرح تسلیم کیا جائے جس طرح اللہ کا قول۔ اسی کو قرآن کی زبان میں "ند" کہا گیا ہے۔

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا (الایہ)

میرے اور توقیر کے لئے یہ ایک عمدہ مبحث ملا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ہم دونوں اس عالم میں بستے تھے جس کے آسمان کے نیچے اور جس کی زمین کے اوپر تقلید شخصی کا وجود ہی نہ تھا پھر اس کے متعلق بحث ہی کیا کرتے۔ لہٰذا ہم نے یہ تحقیق شروع کی کہ تقلید مسلمانوں پر مسلط کیونکر ہوئی۔ کئی ہفتہ کی محنت اور کوشش سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ فقہ جو شرعی قوانین کا نام ہے اس کی ترتیب خود مرکز کا فریضہ ہے اور اس کو ہر ماحول میں ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ و تبدیلی کا اختیار ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد متغلبین نے جو مرکزیت پر قابض ہوگئے تھے اپنے اس فریضہ کا لحاظ نہیں رکھا اور امورِ سلطنت کے عمل درآمد کیلئے کسی ایک عالم کی فقہ اختیار کرلی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو اجتہاد مطلق کا دروازہ بھی بند کرنا پڑا تاکہ ان کی مروجہ فقہ سے تصادم نہ ہوسکے۔ اس طرح پر استبداد نے جہاں مسلم کو حریتِ عمل سے محروم کیا تھا وہاں حریتِ فکر بھی اس نے غصب کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری امت شخصی حکومت کی طرح شخصی تقلید میں گرفتار ہوگئی۔ چونکہ مختلف استبدادی سلطنتوں نے مختلف علماء کی فقہیں اختیار کیں اس لئے امت متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ ان مقلدین کا اختلاف بظاہر فروعی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اصولی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے مخصوص امام کی تقلید کا بھی عقیدہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جس طرح سنی اور شیعہ میں اصولی اختلاف ہے، اسی طرح اہل سنت کے مذاہب اربعہ بھی جدا جدا فرقے ہیں۔ ہر ایک کے امام الگ

الگ ہیں۔ کتابیں الگ الگ ہیں اور علماء الگ الگ ہیں۔

اس نتیجہ پر پہنچتے ہی دفعۃً حدیث کی حالت بھی سامنے آگئی کہ وہ بھی مرکز سے نہیں ملی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحیح جانشینوں نے اس کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کے حوالہ نہیں کیا۔ بلکہ تمام تر رواۃ سے ملی ہے جنھوں نے رضاکارانہ اس کو روایت کیا ہے اور جن کی کوئی مرکزی حیثیت نہیں تھی۔

اس حقیقت پر نگاہ پڑتے ہی میری روح لرز اٹھی اور میں نے کہا یا اللہ! سوائے تیری کتاب کے کہیں پناہ نہیں ہے جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے۔

ولن تجد من دونہ ملتحدا

کچھ حدیث کے متعلق

یہ خیال اس وقت دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا۔ سنہ۱۹۳۲ء میں لاہور میں مجھ کو معلوم ہوا کہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی حدیث کے قائل نہیں ہیں۔ ان سے جا کر ملا۔ تین گھنٹہ تک گفتگو رہی جس کو انھوں نے اسی بحث میں ضائع کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں جہاں جہاں آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان۔ میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں۔ انھوں نے سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سخت مشکل میں گرفتار تھے اور سوائے تاویلات رکیکہ کے عمل کے لئے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔ پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت بالکل واضح ہو گئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں۔ اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کیلئے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔

کچھ قرآن کی نسبت

قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی اور نظری کتاب بنا رکھا ہے اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا۔ زیادہ توجہ علمی و ادبی لطائف یا فقہی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق جن کی تعلیم کے لئے وہ نازل کیا گیا ہے نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا جس کے بعد سے میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا۔ میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چونکہ میری زندگی پر پڑا ہے اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

سنہ۱۹۱۲ء میں جب میں علیگڈھ کالج میں مدرس تھا، ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سرسبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں۔ وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی۔

میں پہاڑی سے اتر کر اس کی طرف گیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام تر سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں۔ ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر چونورانی تھے اس طرح نظر آئے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک پیکر زیادہ ممتاز تھا۔ میں حیرت سے دیکھنے لگا یہانتک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ روشنی کی طرح نیچے اتر کر جنوبی رخ کی سیڑھیوں سے چلے گئے۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مغربی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں۔ کوئی کسی سے بولتا نہیں۔ سب چپ ہیں۔ سب سر برہنہ ہیں اور جوان۔ سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں اور چہروں پر سیاہ داڑھیاں۔ ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر پیلے ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ حفاظ جماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں۔ اس نے کہا کہ بیشک۔ سلام پھیرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس میں سے نکلے تھے۔ میری نگاہ کمرے سے نکلتے ہی گنبد کی طرف گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ پانچوں شکلیں پھر اپنی جگہ پر ہیں۔ اب میں نے ان نمازیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز پیکر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ تم نہیں پہچانتے۔ یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا ان کے بعد۔ اس نے جواب دیا کہ ابوبکرؓ۔ میں نے کہا پھر کون ہے؟ بولا کہ عمرؓ۔ میں حیران ہوا کہ یہ یوسفؑ کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ! معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے یوسف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کا دل کو یقین آگیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپؐ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ فلاں کا بیٹا فلاں آگیا ہے اس کی امانت اس کے حوالہ کر دو۔ وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا پہلے ایک کلام مجید دیا جس کو میں نے دائیں بغل میں دبایا۔ پھر سات رنگ کے شیشوں کی ایک بڑی رحل جس کو بائیں بغل میں رکھا اس کے بعد ایک قلمدان جس کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پا کر میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ میں نے گردن جھکا کر شکریہ کا سلام کیا اور ان کو لئے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم معانی کا نیا راستہ کھلنے لگا۔ یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں اور قرآنی حقائق کے چہرہ سے نقاب اٹھنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک مدتِ مدید کے بعد دو حقیقتیں عین الیقین بن کر سامنے آگئیں۔

(۱) قرآن دینِ الٰہی کا کامل اور بے شائبہ مجموعہ ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اسکی ہدایت کیلئے کافی ہے۔

(۳) قرآن مفصل کتاب ہے جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے۔ اور اختلاف فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے تعین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آگیا۔ اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت، رحمت، نور، شفاء لما فی الصدور بلکہ سرتاسر نجات ہیں۔

اس نعمت عظمیٰ پر میں اپنے رب کا شکر گذار ہوں جس نے قرآن نازل فرمایا اور اس کے سمجھنے کی توفیق دی۔ اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ پھر اس کو دلسوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

انہی تینوں باتوں کو سمجھانے کے لئے میں نے تعلیمات قرآن لکھکر شائع کی جو اسلام میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔

یہ کتاب عقائد و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی نہج پر میرے مخلص رفیق چودھری غلام احمد خاں پرویز بی۔اے نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہوگئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دلکش مشغلہ ہوجائے گا اور تراجم اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہوجائے گی۔ [۱]

کاش آج توقیر الحسن زندہ ہوتے تو میرا ساتھ دیتے۔ بیچارے عبدالغفور کی زندگی تکمیل علم سے پہلے ختم ہوگئی اور توقیر چند سال درس دینے کے بعد وفات پاگئے۔ اب جب کبھی یہ ہنستے بولتے میرے تصور میں آجاتے ہیں تو اس وقت کا پورا ماحول اپنے ساتھ لاتے ہیں اور مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں ؎

اے عیش رفتہ پھر تجھے پاؤں کہاں سے میں — جو دن گزر گئے انھیں لاؤں کہاں سے میں

دہلی میں میرے ساتھیوں میں سے مولوی عبدالحفیظ صاحب ہیں جو میاں صاحب کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ جب میں پڑھتا تھا اس وقت میاں صاحب نے ان کو بھوپال بھیجدیا تھا۔ یہ رہتے تھے شیخ حسین عرب کے یہاں اور پڑھتے تھے ہمارے ساتھ۔ سوائے دینی بحثوں کے اور کسی بحث میں کم حصہ لیتے تھے۔ اب جو کبھی اہل حدیث کے کسی جلسہ میں مل جاتے ہیں تو پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

۱؎ بتوفیق ایزدی اس کتاب (معارف القرآن) کی اب تک چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ (طلوع اسلام)

اساتذہ :- میرے استاد در اصل دو ہی تھے۔ مولوی فتح اللہ صاحب اور والد۔ ان کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں :-

مولوی فتح اللہ صاحب

موضع مہوارہ ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ہمارے ہم وطن تھے۔ انھوں نے والد سے اس زمانہ میں پڑھا جبکہ وہ بنارس میں درس دیتے تھے۔ والد نے اپنی مہتممی کے زمانہ میں مدرسہ سلیمانیہ میں عربی کے مدرس دوم کی جگہ پر ان کو بلا لیا۔ پڑھانے سے عشق تھا۔ کبھی چھٹی نہیں لیتے تھے اور ہمیشہ وقت سے پہلے مدرسہ میں پہنچ جاتے تھے۔ مدرس اول مولوی مظہر حسین صاحب کہ وہ بھی مہوارہ کے متصل موضع بھادوں کے رہنے والے تھے جب بھوپالی رباط کے منتظم بنا کر مکہ مکرمہ بھیج دیئے گئے اس وقت ان کی جگہ مولوی فتح اللہ صاحب کو ملی۔ آخر میں یہ مدرسہ سلیمانیہ کے مہتمم بھی ہو گئے تھے۔ پھر پنشن لے لی۔ سالِ گزشتہ یعنی سنہ ۱۹۴۹ء میں مارچ کے مہینہ میں تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

جس وقت میں بھوپال میں آیا تھا ان کی اہلیہ زندہ تھیں۔ وہ کبھی کبھی والدہ کے پاس بھی آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد انتقال کر گئیں۔ مولوی صاحب نے پھر نکاح نہیں کیا۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ تنہا ایک چھوٹے سے مکان میں خیرن بی کی مسجد کے متصل جو ہمارے گھر سے کسی قدر فاصلہ پر ہے رہتے تھے۔ نہایت باوضع اور پابندِ اوقات۔ نہ کبھی تہجد ناغہ ہوئی نہ جماعت۔ الا ماشاء اللہ۔

لباس اور غذا میں صفائی اور سادگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو بیمار نہیں دیکھا۔ ملنسار ایسے کہ کسی کو ان سے اور کسی سے ان کو شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آخر میں دو حج بھی کئے۔ عام طور پر لوگ اور بالخصوص اہلِ محلہ ان کو قطب سمجھتے تھے۔ ایک بار ہماری جماعت میں ان کی ذات زیرِ تنقید آ گئی۔ بجز اس کے کوئی گرفت نہ ہو سکی کہ کسی قدر زیادہ بولتے ہیں۔ والد بھی آ گئے۔ انھوں نے جب ہماری رائے سنی تو فرمایا کہ فرغل پہ دو شالہ بھی تو اوڑھتے ہیں اور پھوٹ قلاقند کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہم سب ہنسنے لگے۔

میں نے جب سے ان سے پڑھنا شروع کیا اس وقت سے میرے اوپر ان کی شفقت برابر بڑھتی گئی۔ وہ مجھ کو بمنزلہ فرزند کے سمجھتے تھے اور پدرانہ محبت رکھتے تھے۔ وفات سے چار سال پہلے ڈاکٹر اشرف کو آنکھیں دکھانے اور مجھے دیکھنے کے لئے دہلی آئے تھے۔

مولوی سلامت اللہ صاحب

یہ میرے والد کا نام ہے۔ تاریخ ولادت صحیح نہیں معلوم۔ مگر ایک بار ان کی زبان سے سنا تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء میں سات سال کے تھے۔ ان کے باپ

شیخ رجب علی جو درویش صفت آدمی تھے اور میاں صاحب بولے جاتے تھے ان کو دس سال کا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ دو چھوٹی بہنیں تھیں اور والدہ۔ کوئی سرپرست نہیں تھا۔ میاں صاحب نے کچھ ابتدائی تعلیم دیدی تھی جس کی وجہ سے علم کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے گھر سے بے سروسامانی کے ساتھ نکلے اور جونپور میں جا کر مولوی حیدر حسین صاحب کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں دس برس تک پڑھتے رہے۔ ذہانت، شوق اور محنت تینوں چیزیں ان کے اندر جمع تھیں اس وجہ سے ممتاز طالب العلم مانے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں وہاں مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی مدرس تھے جو علوم عقلیہ اور درویشی دونوں میں کامل تھے ان سے درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مولانا محمد قاسم دیوبندی علیہ الرحمۃ کے پاس جا کر ایک سال رہے اور وعظ و ارشاد کا طریق سیکھا۔ اس کے بعد دہلی میں میاں صاحب سے دو سال تک حدیث پڑھی اور انھیں کا رنگ اختیار کیا۔

وطن میں واپس جانے کے بعد کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں مصروف ہوئے۔ جا بجا مواضع میں ان کی تلقین سے اہل حدیث کی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ قبر پرستی، پیر پرستی، اور تعزیہ پرستی کو ضلع کے اکثر حصہ سے مٹا دیا۔ اس زمانہ میں جیراجپور میں جو لوگ ان سے حدیث پڑھتے تھے ان میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری بھی تھے۔

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک دوسرا موضع بندول ہے جہاں کے ایک معزز وکیل کے بیٹے مولوی شبلی صاحب نعمانی اس زمانہ میں تکمیل علوم کر کے آئے تھے۔ ان کے اوپر تقلید کا غلبہ تھا اس وجہ سے انھوں نے والد کے ساتھ بعض امور میں مباحثہ کرنا چاہا۔ والد بحث کو ناپسند کرتے تھے مگر ان کے بعض شاگردوں خاصکر مولوی اسداللہ صاحب نے جو موضع روان کے رہنے والے تھے جوابات دیئے اور طرفین میں رسالہ بازی ہوئی۔

دو سال کے بعد والد بنارس بلائے گئے۔ وہاں تلوچن محلہ کے مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا۔ ان کے اسوقت کے شاگردوں میں سے اب صرف ایک شخص شمس العلماء مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق مہتمم دارالعلوم ندوہ لکھنؤ زندہ ہیں۔

بنارس میں والد کے تعلقات پنڈتوں کے ساتھ بھی ہو گئے تھے۔ ان سے یوگ کا فن سیکھا۔ چنانچہ بھوپال میں ہر جمعرات کی شام کو ان کے پاس شہر کے بڑے بڑے پنڈت روپ رام اور کنھیا لال وغیرہ آ کر جمع ہوتے اور یوگ کے مسائل سمجھتے۔ نیز جب کوئی نامی پنڈت پریاگ یا اجودھیا وغیرہ کا وہاں آتا تو والد ایک رات ضرور اپنے یہاں محفل منعقد کر کے اس کو معہ بھوپال کے پنڈتوں کے بلاتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ علمی گفتگو کرتے۔

بنارس میں کم و بیش آٹھ سال رہے۔ پھر حج کو گئے۔ واپسی کے بعد بھوپال بلائے گئے۔

والد اگرچہ خالص اہلحدیث تھے مگر ان میں تعصب مطلق نہ تھا۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کے لوگ ان کے پاس آتے تھے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا سب کی مدارات اور مدد کرتے تھے۔ کسی سے بحث یا جھگڑا بالطبع ان کو ناگوار تھا۔

ایک بار مولوی محمد بشیر صاحب نے ایک شیعہ وکیل[1] کو ریاست سے نکلوایا۔ والد کو جب اطلاع ہوئی تو فوراً مولوی صاحب کے پاس سمجھانے کے لئے گئے مگر اس سے پہلے سرکاری احکامات نکل چکے تھے۔

مولوی محمد بشیر صاحب نے جب یہ مسئلہ نکالا کہ قربانی آخر ذی الحجہ تک سنت ہے اور اس پر عمل کا اعلان کیا تو لوگوں نے والد سے آکر بیان کیا کہ شاید اس کی مخالفت کریں گے مگر انھوں نے مجھے حکم دیا کہ مولوی صاحب کے یہاں دام دے آؤ کہ جس دن وہ قربانی کریں اس میں ایک حصہ ہمارا بھی رکھیں۔

وہ واعظ شہر تھے اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے اور اہل شہر بالعموم حنفی تھے مگر کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ ہر چھوٹے بڑے میں ان کا وعظ مقبول تھا اور ان کی شخصیت محبوب تھی۔

ریاستوں میں اکثر دنیاوی معاملات میں بھی گروہ بندیاں رہا کرتی ہیں۔ وہ کبھی کسی فریق میں شامل نہیں ہوئے اور نہ کسی کی بے جا طرفداری کی۔

جس غربت میں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی اس کے لحاظ سے ان کی نگاہ میں روپیہ کی بہت قدر ہونی چاہئے تھی مگر وہ اس کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ ان کی تنخواہ خود ہی لاکر اپنے پاس رکھتا تھا اور خانگی ضروریات میں خرچ کرتا تھا۔ کبھی حساب تک بھی نہیں پوچھا۔ ان کی توجہ تمام تر اسی پر مبذول رہتی تھی کہ خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ معاملہ کو صاف رکھیں تاکہ حساب کے دن باز پرس نہ ہو۔ جب کبھی ان کو بخار آتا تو گھر بھر کو اپنے گرد جمع کرکے وصیت کرنے لگتے جس کا ماحصل یہی ہوتا تھا کہ ظاہر اور باطن میں اللہ کا کوئی گناہ نہ ہونے پائے اور کسی بندہ کا کوئی حق سر پر نہ جائے کیونکہ اللہ باوجود غفور و رحیم ہونے کے بھی حقوق عباد کو معاف نہیں کرے گا۔

جب نواب علی حسن خاں نے جو نواب صدیق حسن خاں کے بیٹے تھے محکمۂ تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اسوقت شاہجہاں بیگم نے والد کی وہی تنخواہ جو ہمیشہ کی تھی محکمۂ مناصب میں منتقل کردی اور جملہ حقوق برقرار رکھے۔ شرط یہ تھی کہ بھوپال ہی میں رہ کر اپنے گھر پر طلباء کو پڑھاتے رہیں۔

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۹۸ء میں پیسہ اخبار لاہور میں مترجم ہو کر چلا گیا تھا۔ دوسرے سال جون کے مہینہ میں والد کی علالت کا تار ملا۔ فوراً بھوپال آیا۔ ذات الجنب کا عارضہ تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سر گود میں لیکر پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا کہ تم اچھے بیٹے ہو میں تم سے خوش ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ اے اللہ میرے باپ کے ان الفاظ پر تو گواہ رہنا۔ یہ میرے حساب کے

---

[1] یہ وکیل مرزا ثاقب قزلباش کے والد تھے جو لکھنؤ کے موجودہ شعراء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس وقت بھی جبکہ وہ بالکل نوجوان تھے میرے لئے دلکش تھیں۔

دن کا ذخیرہ ہیں۔

دوسرے دن ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، عشار کے وقت چارپائی سائبان میں تھی۔ دو ملازم پنکھا جھل رہے تھے۔ خیال تھا کہ نیند آگئی ہے۔ میں ان کے قریب ہی نماز پڑھنے لگا۔ یکایک انھوں نے زور کا ایک سانس لیا۔ نوکروں کو احساس بھی نہ ہوا مگر میرا دل کھٹکا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا تو وہی آخری سانس تھا۔ ان کے سرہانے صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اللہ کا احسان ہے جس نے رنج کے پہلے ہی حملہ میں دل پر صبر انڈیل دیا۔ جہانتک ہوسکا قرآن پڑھتا رہا لیکن تاہم وہ رات میرے اوپر سخت گزرگئی۔ وہ میری زندگی میں انقلاب کی رات تھی۔ والد کے چہرہ کے ساتھ دنیا جس قدر مجھ کو خوشنما نظر آتی تھی ان کے بعد پھر کبھی ویسی نظر نہ آئی۔

أَلَا فَلْيَمُتْ مَنْ شَآءَ بَعْدَكَ إِنَّمَا عَلَيْكَ مِنَ الْأَقْدَارِ كَانَ حِذَارِيَا

ان کا انتقال ۳۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۵ر جون ۱۹۰۴ء کو ہوا۔

نماز فجر کے بعد شیخ حسین عرب آئے، انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ جب جنازہ لیکر نکلے تو باہر بڑا ہجوم تھا۔ محبت شاہ کے تکیہ میں جو نواب صدیق حسن خاں کے مقبرہ کے مشرقی جانب سڑک سے ملا ہوا ہے لیجا کر دفن کیا۔ آنے والوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ تین بار جنازہ کی جماعت ہوئی۔

اس واقعہ کے ایک مدت کے بعد ۱۹۱۸ء میں مجھے بھوپال جانے کا اتفاق ہوا۔ والد کے مزار پر گیا۔ دیکھا کہ اس تکیہ کے متصل گوجروں کا ایک محلہ آباد ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اس میں جابجا گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ دل کو سخت رنج ہوا۔ اسی دن مندرجہ ذیل نظم لکھ کر والیۂ بھوپال کی خدمت میں بھیجی۔

حضرتِ نواب سلطانِ جہاں گردوں وقار — آنکہ باصد حشمت وشوکت جہانبانی کند
فرۂ اقبال اسمش راستی کردہ است — درجہاں چوں نام خود بنگر کہ سلطانی کند
مادرِ مشفق بود بہرِ مسلمانانِ ہند — مشکلاتِ قوم مارا حل بآسانی کند
نیتِ پاکش چو صافی تر ز آبِ گوہر است — در ہمہ کارش مدد تائیدِ یزدانی کند
مدح مقصد نیست اینجا مدعائے دیگر است — ورنہ اسلم ہم تواند آنچہ خاقانی کند

بندہ بر درگاہِ تو یک التماس آوردہ ام — زیبدار لطف نگاہے سوئیش ارزانی کند
چوں پس از قرنے گذارِ من بہ بھوپال اوفتاد — جاوداں از آفاتِ دہرش حق نگہبانی کند
بیقرارانہ دواں رفتم سوئے گورِ پدر — ہمچو پروانہ کہ گردِ شمع جولانی کند

دل پُر از سوزِ محبت چشم پُر از اشکِ غم
شمع ساں کز شعلۂ خود قطرہ افشانی کنند

تکیۂ شاہِ محبت آنکہ مدفن گاہِ اوست
بندہ را از رشتۂ جاں جذبِ پنہانی کنند

اندراں تکیہ کہ بر وے رحمتِ بسیار باد
حالتے دیدم کہ بیدا رنج روحانی کنند

از غلاظتہا کہ نا اہلاں دراں تکیہ کنند
دل نمی خواہد کہ آنجا فاتحہ خوانی کنند

بر سرِ گورِ مسلماناں غلاظت کے رواست
ایں چنیں بے حرمتیہا خانہ ویرانی کنند

دیو سیرت مردمانند اندراں قرب و جوار
آں گروہِ کافراں ایں نامسلمانی کنند

چشم میدارم کہ سرکار از رہِ لطفِ عمیم
انسدادِ ایں چنیں افعالِ شیطانی کنند

آفتابِ دولت و اقبالِ تو تابندہ باد
خطۂ بھوپال را عدلِ تو نورانی کنند

توقع صفائی کا حکم ہوگیا اور آئندہ کے لئے بندوبست کر دیا گیا۔

والد کو لکھنے سے ذوق نہ تھا۔ ایک رسالہ تصوف میں لکھا تھا جس کو میں نے پیسہ اخبار کے دفتر میں چھاپنے کیلئے دیدیا تھا۔ اس نے میری عدم موجودگی میں غلط فہمی سے اس کو میرے ہی نام سے شائع کر دیا۔ ادھر چند سال ہوئے حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی اس کو چھاپنے کے لئے لے گئے۔ میں نے تصحیح بھی کر دی تھی۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور مجھے معلوم نہ ہوا کہ اس کو شائع بھی کیا یا نہیں۔ بیعت کے متعلق بھی ایک مختصر تحریر والد کی لی تھی جس کو انھوں نے چھاپا تھا۔ اس کی چند کاپیاں مجھے بھیجدی تھیں۔

مطالعہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مطالعہ کی عادت میں نے ڈال لی تھی اور تحصیلِ علم میں اس کی اہمیت عملاً مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ اس لئے ہمیشہ اس پر اس قدر سختی کے ساتھ مزاولت رکھی کہ کبھی بلا مطالعہ کے سبق نہیں پڑھا۔ رات کو لغات و شروح سے مدد لے کر آنے والے سبق کو کوشش کے ساتھ حل کرتا تھا۔ اور یہ سوچتا تھا کہ انھیں عبارتوں سے استاد مطلب سمجھ لیتا ہے پھر میں کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ رفتہ رفتہ اس میں کامیاب ہوگیا۔ استاد بھی میری اس بات سے واقف تھے۔ اس لئے سبق کے وقت زیادہ تر خارجی بحثیں کرتے تھے۔ تکرار میں میں اپنے ساتھیوں کو پڑھاتا تھا اور میرے ہی بھروسے پر استاد کے سامنے سبق میں وہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔

مطالعہ کی عادت نے مجھے اپنا استاد آپ بنا دیا تھا۔ دراصل میرے سبق پڑھنے کا وقت مدرسہ میں نہیں تھا بلکہ رات کو تھا جبکہ میں اپنے کمرہ کی خاموش تنہائی میں کتابیں لیکر غور کے ساتھ اپنے سبقوں کو حل کیا کرتا تھا۔ والد کی توجہ کا

ہاتھ ہمیشہ میرے دل ودماغ کی نبض پر رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مطالعہ کی یکسوئی میں خلل پڑنے سے مجھ کو تکلیف ہوتی ہے اس وجہ سے خود اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ عشا کے بعد میری بہن جو مجھ سے بہت مانوس تھی اور جس کی عمر اس وقت پانچ چھ سال کی تھی میرے کمرہ میں آرہی تھی۔ والد نے اس کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور سمجھا دیا کہ رات کو کھانے کے بعد بھائی کے پاس مت آیا کرو۔

اگر کسی رات مطالعہ کا موقع نہیں ملتا تھا تو دن کو استاد سے کہہ دیتا تھا کہ آج سبق نہیں پڑھوں گا۔

درس بھوپال میں اس زمانہ میں عربی کے طلبا کی کثرت تھی اور الحمد للہ کہ میں ان میں مقبول تھا۔ اس لئے نہیں کہ میں مہتمم مدارس کا بیٹا تھا بلکہ اس لئے کہ خود مستعد اور بلند طالب علم تھا۔ میں ان سے محبت کرتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور بعض بعض میرے پاس پڑھنے کے لئے بھی آتے تھے اور میں ان کو پڑھاتا بھی تھا۔ والد بھی یہی چاہتے تھے ایک بار انھوں نے ایک ولایتی طالب علم پیر محمد کو میرے سپرد کیا۔ میں ان کو پڑھانے لگا۔ قطبی میں نسبتِ حکمیہ کی بحث آئی۔ میں نے تقریر کی وہ نہیں سمجھے۔ دوبارہ بیان کیا ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ تیسری بار سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر پھر بھی وہ ہمہ تن سوال ہی بنے بیٹھے تھے۔ اگرچہ ان کا سن بھی مجھ سے دگنا تھا اور قد بھی مگر میں نے تنگ آکر کتاب ان کے سر سے ماری اور اٹھ کر چلا آیا۔ لیکن دل میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ کیا اللہ کے خوف سے؟ نہیں۔ کیا اس وجہ سے کہ اخلاقی حدود توڑے تھے؟ نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ والد جب سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیونکہ اس امر کے برداشت کی طاقت میں نہیں رکھتا تھا کہ میری کسی حرکت سے ان کے دل پر کلفت کا غبار آئے۔ سوچتا ہوا سیدھا انھیں کے پاس گیا اور کہا کہ میں ملا پیرو کو نہیں پڑھاؤں گا۔ بولے کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ ان کے پڑھانے سے میں غبی ہو جاؤں گا۔ والد قیافہ شناس تھے۔ میرے چہرہ پر نگاہ ڈالی، گھبراہٹ اور غصہ کے آثار دیکھے۔ کہنے لگے اچھا۔ جاؤ میں ان کو کسی اور کے حوالہ کر دوں گا۔

مصیبت اس وقت آتی تھی جب وہ کسی بنگالی طالب علم کو میرے حوالہ کرتے تھے کہ اس کو سراجی پڑھاؤ۔ عربی مدارس کو جس قسم کے بنگالی طلبا میسر ہوتے ہیں ان سے اکثر اساتذہ واقف ہیں۔ سال بھر میں بھی اگر میں اس کو سراجی پڑھا لیتا تھا تو اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

کتب بینی بعض بعض بحثوں میں میں نے دیکھا کہ تو فیر مجھ سے بازی لے جاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ ان کا استعدال ذہنی مجھ سے تیز تھا یا وہ تقریر میں مجھ سے بہتر تھے بلکہ صرف اس لئے کہ ان کا مطالعہ زیادہ وسیع تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے کتب بینی شروع کی اور ابتدا میں روزانہ کم سے کم سو صفحوں کی رفتار رکھی۔ کتب خانہ مفید عام جس کا ذخیرہ بڑھا کر اب بھوپال لائبریری قائم کی گئی ہے اس زمانہ میں والد کی ماتحتی میں تھا۔ اس میں سے جس قدر

کتابیں چاہتا لاکر پڑھتا۔ ادب، مذہب اور تاریخ سے والد کو ذوق تھا۔ انھیں سے مجھ کو بھی دلچسپی ہوئی۔

علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کی جس قدر کتابیں اس وقت تک شائع ہوئی تھیں ان کا ذخیرہ والد خود اپنی الماری میں رکھتے تھے۔ بحرین کے سب سے بڑے موتی کے تاجر شیخ مقبل جوان دونوں بزرگوں کی کتابیں مصر سے شائع کراتے تھے والد کے دوست تھے۔ جو کتاب چھپواتے اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجتے۔ علی بن ماضی کی بدولت علماء نجد کی کتابیں آتی رہتی تھیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے جس قدر کتابیں چھپوائی تھیں ان کا ہونا تو ہمارے پاس لازمی تھا۔ فتح الباری، نیل الاوطار اور فتح البیان کی کل جلدیں ایک ایک ورق دیکھ کر میں خود لایا تھا۔ اردو کی جدید تصنیفات اس زمانہ میں لکھنؤ، علیگڈھ اور لاہور سے جس قدر شائع ہوئی تھیں ان سب کو میں نے منگایا۔ آخر میں یہ سودا اس قدر بڑھ گیا کہ کتابیں پڑھنے سے سیری ہی نہیں ہوتی تھی اور مسبب الاسباب اس کا سامان بھی کرتا رہا۔ لاہور گیا تو وہاں کی پبلک لائبریری کے علاوہ مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کی مہربانی سے مستشار العلماء کا کتب خانہ میرے لئے وقف تھا۔ علیگڈھ کالج میں رہا تو مشرقی کتب خانہ خود میری نگرانی میں تھا۔ جو کتابیں اب تک نہیں مل سکی تھیں وہ یہاں ملیں۔ پڑھتا رہا اور پڑھتا رہا۔ آخر میں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کیلئے روئے زمین پر صرف ایک ہی کتاب ہے جو عرش سے اتری ہے اور جس کا نام قرآن ہے۔

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیر ما بدستِ شرابِ دوسالہ بود

ملازمت ۱۹۱۳ء کے اواخر میں بھوپال سے پیسہ اخبار لاہور میں عربی کا مترجم ہو کر چلا گیا۔ وہاں دو سال رہا اور اخبار نویسی کا تجربہ حاصل کیا۔

۱۹۱۶ء میں علیگڈھ کالج میں آیا یہاں کالجیٹ سکول میں عربی اور فارسی کا مدرس ہوا۔ چھ سال کے بعد کالج کی لٹن لائبریری میں مشرقی کتب کا شعبہ میرے سپرد کیا گیا اور میں نے اس کی فہرست مرتب کی۔

کچھ زمانہ کے بعد جب کالج یونیورسٹی ہو گیا اس وقت یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ترک موالات کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ مولانا محمد علی مرحوم کے اصرار پر اس میں چلا آیا اور تاریخ اسلام کا مضمون میرے سپرد ہوا۔ یہی سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔

تصنیف لکھنے کا مجھے بچپن سے شوق ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی تھی اس وقت فارسی قواعد میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں "قواعد اسلمیہ" کے نام سے لکھ کر بھوپال کے سرکاری مطبع سے شائع کرایا تھا۔ لیکن میری تصنیفی زندگی دراصل علیگڈھ کالج سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے وہاں میں نے ۱۳۲۵ھ میں تاریخ القرآن لکھی جو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نیز علیگڈھ کالج میں دینیات کے نصاب میں داخل کی گئی اور عرصہ تک رہی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں خواجہ حافظ شیرازی کی لائف "حیاتِ حافظ" لکھکر علیگڑھ کالج سے شائع کی۔ یہ کتاب اسوقت بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ سنہ ۱۹۰۱ء میں اس سال کی جملہ اردو میں شائع شدہ کتابوں میں چوٹی کی کتاب تسلیم کی گئی۔ اس کے دوسرے سال "حیاتِ جامی" لکھی جو اس سے بھی زیادہ مقبول ہوئی۔

فرائض حنفی یعنی وراثت میں مجھے بعض بنیادی غلطیاں نظر آئیں۔ میں نے اچھی تحقیق کی بالآخر غور و خوض کے بعد اسکی تمام اصولی غلطیاں میرے سامنے نمایاں ہوگئیں۔ چنانچہ میں نے "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی جسکو ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس میں وہ تمام باتیں دلائل کے ساتھ واضح کیں جو اس فن کی تدوین میں قرآن کے خلاف واقع ہوئی ہیں۔

علیگڈھ یونیورسٹی ہی میں میں نے تاریخ الامت لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب میں جامعہ ملیہ میں آگیا۔ کئی سال میں اسکے سات حصے لکھے گئے جس میں ابتدائے اسلام سے مصطفیٰ کمال مرحوم کے الغائے خلافت تک اسلام کی تاریخ آگئی۔ اس کی زبان سادہ رکھی اور طرزِ بیان آسان تاکہ ہر مسلمان طالب علم بلکہ ہر پڑھنے والا اس سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ بلا کسی کوشش اور سفارش کے اس کے مختلف حصے مختلف یونیورسٹیوں۔ اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں داخل ہوگئے۔ خاصکر اس کی پہلی جلد (سیرۃ الرسول) بیشتر اسلامی اسکولوں کے نصاب میں ہندوستان کے طول و عرض میں لے لی گئی۔ یہی کتاب ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے عام دلچسپی پیدا کرائی۔ بالخصوص مسلمان طلباء میں۔

دینیات کے نصاب کیلئے دو مختصر رسالے مسلمان طلبار کے لئے لکھے۔ ایک عقائد میں "عقائدِ اسلام" کے نام سے، دوسرا شریعت میں "ارکانِ اسلام"۔ ان کو ایسے آسان۔ جدید اور دلچسپ ڈھنگ سے لکھا کہ بہت مقبول ہوئے اور مختلف مقامات پر دینیات کے نصاب میں شامل کئے گئے۔

اسی طرح قومی، ملی اور تاریخی نظمیں جو میں نے مختلف موقعوں پر لکھی تھیں ان میں سے دس نظموں کا مجموعہ "جواہرِ ملیہ" کے نام سے جامعہ ملیہ نے چھاپ کر اردو ادب کے نصابِ تعلیم میں داخل کیا ہے۔

جب اہلِ نجد کا سنہ ۱۹۲۴ء میں ظہور اور غلبہ ہوا اور وہ حرم مکہ پر قابض ہوگئے اور شریف حسین کو وہاں سے نکالا اسوقت ان کی تاریخ کی ہندوستان کے ہر گوشہ سے مانگ ہوئی میں نے لوگوں کے حسبِ طلب تاریخ نجد لکھی۔ بہت سی غلط فہمیاں جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نجدیوں کی بابت تھیں اس کتاب سے رفع ہوگئیں۔

اس سے پہلے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی مفصل سیرت لکھی تھی۔ آخر میں تعلیماتِ قرآن لکھی جس میں اصول و عقائدِ اسلام کی خود اسی کی آیات سے تفصیل کی اور یہ ثابت کردیا کہ قرآن کریم اسلام کی مستقل اور مکمل کتاب ہے اور وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک

کائنات میں انسان کا مقام

(ایس۔ ایچ۔ باقر صاحب ڈپٹی سکریٹری وزارت خارجہ پاکستان)

جب سے انسان شعورِ ذات سے آشنا ہوا ہے اس کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا ہے کہ کائنات میں میرا مقام کیا ہے؟ میری زندگی کا کیا مقصد ہے اور گرد و پیش کے عالمِ محسوسات سے میرا کیا تعلق ہے؟ انسان نے اس اساسی سوال کے متعدد جوابات وضع کئے لیکن جب اس نے ان جوابات کو تجربہ اور آزمائش کی میزان میں رکھا تو مقام و شرف انسانیت کا پلڑا غیر معمولی طور پر ہلکا نکلا۔ خود اس کے وخود پسند انسان کا درجہ ان سے بہت ہی حقیر ہو گیا۔

ذرا بعض جوابات پر طائرانہ نگاہ ڈال کے دیکھئے۔ برہمن کا فلسفہ مقابلتہً پرانا ہے۔ اس نے جو جواب اس اہم سوال کا مہیا کیا وہ یہ تھا کہ انسان کی زندگی بجائے خود اس کی تمام مصائب کی علت ہے۔ اس کی خواہشات اسے جہنم کی طرف دھکیل رہی ہیں، اور نروان (نجات) کی واحد صورت استہلاک خواہشات اور نفی ذات ہے۔ لہٰذا انسان کی صحیح جگہ گوشۂ رہبانیت ہے، اور اگر انسانی زندگی میں عمل کا کچھ بھی دخل ہے تو اس عمل کا میدان ہمالیہ کی یخ بستہ و یخ پوش بلندیاں ہیں۔

برہمنیت کے بعد عیسائیت کا دور آتا ہے۔ عیسائیت کے نزدیک انسان پیدائشی گناہگار ہے۔ پیدائش اس کا ایسا گناہ ہے کہ جس کے کفارے کے لئے خدا کو اپنے بیٹے کو مصلوب کرنا پڑا۔ شوپنہار کے الفاظ میں اس قنوطی فلسفہ کا نکتۂ آخری یہ تھا

> دنیا ایک دائم موسم سرما ہے جس میں ایک اندھی قوت ایسی لاتعداد گوناگوں اقسام کی زندہ اشیا کا پیکر محسوس اختیار کرتی رہتی ہے جو کچھ وقت کے لئے اپنے نمود و اظہار کا ماتم کرتی ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتی ہیں۔

بیسویں صدی کا ذہن ایک خطرناک خود فریبی کا شکار ہے۔ وہ اس طفلانہ خوش خیالی میں مگن ہے کہ سائنسی اکتشافات و ایجادات کے اس دور نے انسان کو آزادی کے ایک نئے عہد سے متعارف کرا دیا ہے اور اب وہ ناکامی اور مایوسی کی زنجیروں سے بالآخر رہا ہو کر امید اور آزادی کی نئی جنتیں آباد کر سکے گا۔ یہ تصور کس قدر غلط ہے! اسے شین (Sheen) کے الفاظ میں سنئے،

> جب نسلاً بعد نسلٍ فلاسفہ نے سائنس کی ایسی توجیہیں جاری رکھیں جن میں انسانی شخصیت کا استخفاف پایا جاتا تھا تو انسان کا مقام تیزی سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ کوپرنیکی انقلاب سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اب انسان بالکل

غیراہم شے ہو کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ زمین آئندہ کیلئے کائنات کا مرکز نہیں رہی۔ یہ کائناتی تخفیف اس حد تک پہنچ گئی کہ ڈاکٹر ہیری ایلمر بارنز نے کہہ دیا کہ اب انسان ایک حقیر کیڑے سے زیادہ وقیع نہیں رہا۔ اس افلاکی ضرب کے ساتھ ساتھ انسانی وقار پر ایک کاری ضرب علم الحیات نے لگائی جبکہ فلسفیوں نے ڈارون کے تجربات و نظریات سے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان حیوان سے متمائز نہیں نہ اس سے بلند ہے۔

آخری ضرب نفسیات کی جانب سے پڑی جبکہ فرائڈ نے کہا کہ ایغو اپنے گھر کا مالک نہیں ہے انسانی وقار کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو گیا جب فرائڈ نے اعلان کیا کہ ہو سکتا ہے کہ آخر کار حیوان پر انسان کی برتری کا راز اس کے عصبی عوارض و عدم توازن (Neurosis) کی اہلیت میں مضمر ہو۔ جونہی انسان کو نظریہ ڈارون کے مطابق حیاتیاتی طور پر یا نظریہ فرائڈ کے مطابق نفسیاتی طور پر یا نظریہ مارکس کے مطابق معاشیاتی طور پر مقدر قرار دیدیا گیا، انسانی حریت و آزادی کا لعدم ہو گئی۔ جس طرح مارکس اور اس کے متبعین نے تاریخ کو پیداوار اور اس کے متعدد ذرائع کی سطح تک پہنچا دیا، اسی طرح فرائڈ نے فکر اور تمدن کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیا کہ یہ وہ مختلف مظاہر ہیں جن سے انسان ان قربانیوں کی صلہ جوئی کرتا رہتا ہے جو انسانی معاشرت میں رہنے کی صورت میں اسے کرنا پڑتی ہیں۔

(Philosophy of Religion)

زندگی کے آخری حصے میں ایچ۔ جی۔ ویلز نے اسی فلسفہ کو یوں قلمبند کیا:۔

یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ فطرت کا میلان انسان کی طرف زیادہ ہے بہ نسبت ان سمندری اژدہوں کے جو آج بالکل فنا ہو چکے ہیں۔ رجائیت کے طبعی رجحان کے باوجود میں دیکھ رہا ہوں کہ کائنات انسان سے اکتا چکی ہے اور اس سے بے رخی برت رہی ہے۔ اب انسان کا اختیار و ارادہ زائل ہوتا جا رہا ہے اور وہ دن بدن کشاں کشاں آلام، ذلت اور ہلاکت کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔

اس فلسفیانہ اور سائنسی پس منظر میں بیسویں صدی کا آغاز اور اقبال کا ظہور ہوا۔ ہر چند اقبال نے مکتب فرنگ سے ہی تعلیم حاصل کی جو محولہ بالا ذہنیت کی حامل تھی، تاہم اس نے کائنات میں مقام انسان کا جداگانہ تصور پیش کیا۔ اقبال نے سب پہلے اس سوال کو لیا کہ آیا انسان اس محسوس و مشہود کائنات کا آلہ کار بنایا گیا ہے یا اس کائنات کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ انسان اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے؟ اس سوال کا قطعی جواب اقبال نے یہ دیا:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

اقبال نے بتایا کہ اس بزمِ کائنات کا صدر انسان ہے۔

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم　　سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

جاوید نامہ میں اقبال نے جمال الدین افغانی کے منہ سے کہلوایا:

آنچہ در آدم بگنجد عالم است　　آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و ماہ از جلوتش　　نیست راہ جبریل را در خلوتش
برتر از گردوں مقام آدم است　　اصل تہذیب احترام آدم است

یہ اقبال ہی کے فکر کی بلندی اور جرأت کا فیض ہے کہ موجودات کائنات کی باہمی اضافی قدر و قیمت کا صحیح تعین ممکن ہو سکا جیسا کہ اس نے کہا ہے:

تو قدر خویش ندانی بہا ز تو گیرد　　وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

فکرِ فرنگ کا حاصل تو یہی تھا کہ انسان حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشیاتی قوی کا زبوں صید ہے، کہیں وہ "تقدیر" کے شکنجہ میں کسا ہوا ہے، کہیں بے قابو لاشعور کا مجبور مظہر ہے اور کہیں تاریخی وجوب کی کٹھ پتلی۔ اقبال نے اس ننگِ انسانیت فلسفہ کو سرِ پائے استحقار سے ٹھکرایا اور غیر مبہم اعلان کر دیا کہ انسان نہ محض اپنی تقدیر خود بناتا ہے بلکہ جملہ موجوداتِ کائنات کی تقدیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے　　کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہی نہیں کہ انجم شناس انسان کا مقام متعین کرنے سے قاصر ہے بلکہ خود خدا کو تقدیر کے ہر موڑ پر انسان سے استصواب کرنا ہوتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اسی خیال کو اقبال نے اپنے خطبات موسومہ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں دہرایا ہے۔ الفاظ ملاحظہ کیجئے:

جب میرے سامنے عمل کی متعدد راہیں کھلی ہوں تو خدا بھی میرے لئے معین نہیں کر سکتا، نہ فیصلہ و انتخاب کر سکتا ہے۔

کیونکہ

آخری الغیو نے انفرادی اقدام کی صلاحیت رکھنے والے محدود الغیوؤں کو ابھرنے کی اجازت دیکر اپنی مشیت سے اپنی آزادی کو محدود کر لیا ہے۔

پوری جرأت سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد وہ آخری طور پر کائنات میں انسان کا مقام متعین کرتا ہے:

ایسے محدود الغیو کو ابھرنے کی اجازت دیدینا جو متعدد متبادل طریق ہائے کار کی اضافی افادیتوں کا جائزہ لے کر ان میں سے

ایک کو منتخب کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، ایک بہت بڑا خطرہ Risk مول لینے کے مترادف ہے، کیونکہ نیکی اختیار کرنے کی آزادی برعکس راہ اختیار کرنے کی آزادی کو بھی مستلزم ہے۔ یہ حقیقت کہ خدا نے یہ خطرہ مول لیا ہے بین ثبوت ہے کہ خدا کو انسان پر بے پناہ اعتماد ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرے۔

انسان اس اعتماد کو کیسے صحیح ثابت کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی اقبال ہی سے سنئے:

انسان کو کائنات کے حقیقی مقاصد میں شریک ہونا ہے اور اپنی تقدیر کے ساتھ ساتھ تقدیرِ کائنات کی یوں تشکیل کرنی ہے کہ قوائے فطرت سے ہم آہنگ ہو کر ان کو اپنے عزائم و مقاصد کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس ارتقائی تبدیلی کے عمل میں خدا انسان کا شریکِ کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس کی پہل کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمام مخلوق میں صرف انسان ہی ہے جو اپنے خالق کی تخلیقی حیات میں شعوری طور پر شرکت کی اہلیت رکھتا ہے۔ انسان ہی بہتر دنیا کے تصور کا مالک ہے نیز یہ ملکہ بھی کہ وہ است (is) کو بائست ought to be میں تبدیل کر دے۔ لہٰذا انسانی ایغو اپنے غیر مختتم عمل (Endless Career) کے دوران میں جس جس ماحول میں بھی مصروفِ عمل ہوتا ہے، اسے اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

زبورِ عجم میں ہے:-

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو　　گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بائست

یہی وہ رفیق ہے جو "است" کو "بائست" میں تبدیل کرتا ہے، اور اقبال کے الفاظ میں خود خدا جس کی تلاش میں ہے:

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور　　کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن　　خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اسی لئے اقبال نے آگے چل کر کہا ہے:

شاخِ نہالِ سدرہ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شوی منکرِ خویشتن مشو

یہ ہے وہ مقام جو اقبال انسان کو اس کائنات میں عطا کرتا ہے اور یہ ہے وہ طریقہ جس سے انسان اس مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ

(خواجہ عباداللہ اختر صاحب جہلم)

[اس مقالہ میں محترم خواجہ صاحب کا لہجہ خلافِ عادت ذرا سخت ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ بحث بڑی اہم اور مفید ہے اس لیے ہم مقالہ کو بالفاظہٖ شائع کر رہے ہیں۔ ہم داعی الی الحق صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ خواجہ صاحب کے لہجہ کی سختی سے درگزر کرتے ہوئے اپنی توجہ اصل موضوع پر مرکوز فرمائیں۔ طلوعِ اسلام]

طلوعِ اسلام بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۵۰ء میں میری صلوٰۃ الوسطیٰ کی توجیہ یہ کی تھی کہ اس سے مراد تعدیل ہر امر ہے اور مسلمانوں کو امت وسطیٰ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کو ہر ایک امر میں میانہ روی سکھائی گئی ہے اور اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو بھی سراہا گیا ہے جو تعدیل پسند ہیں۔ یہ توجیہ جناب داعی الی التفسیر للخواجہ احمد الدین مغفور نے تسلیم کرتے ہوئے یہ فقرہ چست کیا ہے کہ ایسی صلوٰۃ یعنی ذکرِ الٰہی والی نماز کو گنتی کی بحث میں پیش کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ خدا تعالیٰ ان آیات کے ساتھ ہی فرماتا ہے کہ میں یہ آیتیں بیان کرتا ہوں تاکہ تم عقل سے کام لو کرو۔ داعی صاحب کے خیال میں میں نے یہ حماقت کی کہ دوسری توجیہ بھی ان حضرات کے سامنے پیش کر دی جو میری اول الذکر توجیہ سے اتفاق نہ کریں یعنی صلوٰۃ یوم الجمعہ۔

جناب داعی نے جو لکھا وہ تقلیداً ہی لکھا۔ تقلید ناگزیر امر ہے لیکن اگر علیٰ بصیرت کرتے تو تقاضائے عقل یہ تھا کہ میری توجیہ اول الذکر پڑھ کر "احسن" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ قرآن حکیم کا فتویٰ ہے کہ اگر تقلید علیٰ بصیرت نہ کی جائے تو شرک ہے "وانا من المشرکین" (۱۲:۱۰۸)۔ اگر تفسیر کا پروپیگنڈا ہی منظور تھا تو اور طریقے بھی ہیں۔ جناب داعی نے "صلوٰۃ الوسطیٰ" کے عنوان کے تحت جو اقتباس خواجہ صاحب کی تفسیر کا دیا ہے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ "تمام نیک کام جو رضائے الٰہی چاہنے کے لئے کئے جائیں عبادتیں اور نمازیں ہیں" لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ "تمام نیک کام کیوں نیک ہیں؟ ایسے نیک کاموں کو تو ہمیں گنوایا جو بیشمار ہیں، لیکن بحوالہ قرآن حکیم اصل اصول نیکی بیان کر دیا یعنی "عدالت"۔ افراط و تفریط سے پرہیز کرنا ہی تقویٰ ہے۔ اس کے تحت سب نیکیاں آ جاتی ہیں، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات یا خلق سے۔ اگر داعی صاحب محض مقلد نہ ہوتے تو میں ضرور یہ نیک مشورہ دیتا کہ

چراغی بحرفِ کسان خامہ دار   ضریبے ز تحقیق خودہم بیار

میری رائے میں خواجہ صاحب کی تفسیر بلند پایہ ہے۔ لیکن تحسین ناشناسی سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ایک تفسیر ہی ہے اور ماحول کے اثر سے بے نیاز نہیں۔ اور اغلاط سے بھی پاک نہیں۔ اس پر میرا تبصرہ "البیان" میں شائع ہو چکا ہے۔ ہر دست یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

میرا دعویٰ تو صرف اتنا ہے کہ فرض صرف دو نمازیں ہیں جن کے اوقات بھی دو ہیں اور رکعات بھی دو ہیں۔ باقی سب نوافل۔ اگر اللہ والے چاہیں تو شوق سے ادا کریں مگر تعدیل کا بھی لحاظ رکھیں جو تمام عبادات اور معاملات میں کارفرما ہے۔

داعی صاحب لکھتے ہیں کہ "صلوٰۃ الوسطیٰ" سے مراد صلوٰۃ الجمعہ نہیں اور نمازِ عصر بھی نہیں جس کا مذکور قرآن میں نہیں لیکن صلوٰۃ الجمعہ اس لئے کہ اس کے متعلق "واضح حکم موجود ہے"۔

"واضح حکم" کی تشریح اگر دائرۂ تقلید سے باہر آ کر فرماتے تو ممکن ہے کہ طالبانِ حق آپ کی تحقیق کی داد دیتے، لیکن قرآن حکیم انسانی طبیعت اور ظلم و جہل سے خوب واقف ہے وہ "واضح حکم" اسے قرار نہیں دیتا جو داعی صاحب کے ذہن میں ہے۔ صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشا اور صلوٰۃ "من یوم الجمعہ" صرف نام ہیں۔ "صلوٰۃ العشا" کو داعی صاحب نے تقلیداً تیسری نماز قرار دیا ہے۔ اور دوسرے مقلدین جو پانچ نمازیں فرض تعین کرتے ہیں نمازِ عصر کو صلوٰۃ الوسطیٰ کہتے ہیں اور داعی صاحب نمازِ شام کو اگرچہ صلوٰۃ الوسطیٰ نہیں کہتے مگر ان کے عقیدہ کے مطابق نمازِ شام دو نمازوں کے درمیان واقع ہونی تو "وسطیٰ" ہی ہوگی۔ اگر قرآن حکیم کسی حکم کی وضاحت داعی صاحب اور دیگر مقلدین کے ذہن پر چھوڑ دیتا تو دنیائے اسلام میں لال بجھکڑوں کی کمی نہ ہوتی۔ جسے داعی صاحب نمازِ شام کہتے ہیں اور دوسرے نمازِ عصر، اس کا کوئی نام ہی قرآنِ عظیم میں نہیں ہے۔

لیل و نہار کے اوقات فطرۃً چرند و پرند بھی جانتے ہیں۔ لیکن دو وقت ایسے ہیں جن پر نہ لیل کا اور نہ نہار کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ دو وقت لسانِ قرآن میں فجر اور عشا سے موسوم ہیں۔ ان کو ہم صبح و شام کہتے ہیں۔ یہ وہ اوقات ہیں جو لیل و نہار میں حد فاصل بھی ہیں اور دونوں کو ملاتے بھی ہیں۔ "نہار" کا وقت طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہے اور یہ دنیوی مشاغل اور کاروبار کے اوقات ہیں۔ "وجعلنا النھار معاشا"۔ ایسی نماز یوم الجمعہ میں ایسے ہی وقت میں ہی کسی وقت ہو سکتی ہے جب لوگ کاروبار میں مشغول ہوں اور ندائے صلوٰۃ پر اسے چھوڑنا پڑے۔ اگر یہ نماز فرض ہے اور ضرور فرض ہے تو داعی صاحب کے عقیدہ کے مطابق تین روزانہ نمازوں پر چوتھی کا بھی اضافہ ہوا۔ مگر جو حضرات پانچ نمازیں فرض قرار دیتے ہیں وہ نمازِ جمعہ کو ظہر کی جگہ دیتے ہیں، یعنی یہ نماز ظہر ہی ہے۔ ان کو داعی صاحب کیا جواب دیں گے؟ کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق تو نمازِ ظہر کوئی نماز ہی نہیں نہ فرض نہ نفل۔

یہی دو وقت فجر و عشا ہیں جن میں دو نمازیں فرض ہیں۔ لفظ عشا کی تشریح میں نے بحوالہ آیاتِ قرآن اپنے مقالہ میں

کردی تھی کہ یہ وہ وقت ہے جو غروب آفتاب کے بعد فوراً شروع ہو جاتا ہے اور "الیٰ غسق اللیل" رہتا ہے۔ اگر داعی صاحب تقلید میں الجھ کر نہ رہ جاتے تو قرآن شریف کے اردو ترجموں ہی کو ایک نظر دیکھ لیتے۔ ہر ایک ترجمہ میں عشا کے معنی اردو میں شام ہی کیے گئے ہیں۔ "الیٰ غسق اللیل" اور "زلفاً من اللیل" ہم معنی ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم اپنے احکام کی وضاحت اور تفسیر فرماتا ہے۔ یعنی "زلف" کی تشریح بھی بحوالہ آیات قرآن کردی تھی اور مزید تفسیر "طرفی النهار" میں بھی ہے۔ قرآنی تفسیر کے بعد جو احسن تفسیر ہے۔ یہ تقلید ہی کا کرشمہ ہے اگر ایک کی جگہ کسی کو دو نظر آئیں۔

نظر آئیں دو عالم جس کو اک عالم یہاں اختر سمجھ لیجے بشر احول ہے وہ ساری خدائی کا

"دلوک" مصدر لازم بروزن فعول ہے جو قیاسی ہے، بصیغہ جمع بھی یہ مصدری معنی ہی دیگا، یعنی ہر حال مصدر لازم ہے۔ ہر ایک ترجمہ میں "ڈھلنا" ہی مصدر اردو میں کیا گیا ہے۔ ڈھلنا میں غروب بھی شامل ہے، لیکن "ڈھلنے" سے غلط فہمی ہو سکتی ہے، اور اسی غلط فہمی میں وہ لوگ الجھے ہوئے ہیں جو "لدلوک الشمس" سے ظہر و عصر و شام کا مفہوم پیدا کرتے ہیں، اور اس سے داعی صاحب بھی نہ بچ سکے۔ اگر اس سے نماز شام کے معنی الطے تیسری نماز سمجھ کر نماز عشا سے پہلے لے جائیں تو ظاہر ہے کہ نماز عشا "لیل" کے کسی وقت میں ہوگی اور "لدلوک الشمس الی غسق اللیل" "زلفاً من اللیل" کا واضح حکم مبہم ہو کر رہ جائے گا۔ قرآنی تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر داعی صاحب تیسری نماز ثابت کردیں تو ہم بھی جھک کر سلام کریں گے لیکن یاد رہے کہ "یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون (۱۰۰)"۔ یہ تو داعی صاحب تسلیم کر چکے ہیں کہ لدلوک الشمس سے مراد وہ وقت ہے جو غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ کہاں ختم ہوتا ہے قرآن میں تو الی غسق اللیل و زلفاً من اللیل و طرفی النهار الفاظ موجود ہیں۔ اب عشا کیلئے رات کی تاریکی میں کسی شپرہ کی آنکھ ہی یہ وقت دیکھ سکتی ہے۔

۲۔ **دو نمازیں** (از لاہوتی صاحب)

آپ نے نمازوں کی تعداد کا ذکر چھیڑ دیا، میں سوچتا ہوں کہ آپ کے اس اقدام کو کیا سمجھوں۔ نیا فتنہ یا اصلاحی کوشش! پانچ نمازیں آخر کم کیوں کی جائیں۔ کوئی برا کام ہو تو اس سے روکا بھی جائے۔ آخر نیکی ہے، ذکر کثیر ہے، مانا کہ قرآن میں اس کی تصریح نہیں، لیکن اس سے کہیں روکا بھی تو نہیں، بلکہ ذکر کثیر کی جا بجا ترغیب ہے۔ پھر تعامل امت بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔ ہم میں پہلے ہی فتنوں اور اختلافوں کی کوئی کمی نہیں کہ ان میں مزید اضافہ کیا جائے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جبکہ تمام دنیائے اسلام کو سب کے سب ۱۳ سو سالہ اختلافات ایک دن میں دریا برد کر دینے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بات قطعاً محتاج دلیل نہیں کہ ہم انہی اختلافات کے ہاتھوں ان برے دنوں کو پہنچے کہ دنیا بھر کی مغضوب و ضال قوموں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھک رہے ہیں، ہمارا پاؤں کہیں جمنے نہیں پاتا۔ اور اگر اب بھی ہم اس آمین، رفع یدین، اور تبرا و تولا کی دلدل میں پھنسے رہے تو وہ دن دور نہیں

جب آنے والی قوموں کی تاریخی کتابوں میں عاد و ثمود کی طرح مسلمان نام ایک قوم کا صرف ذکر یادگار رہ جائے گا جو آپس ہی میں مسئلوں پر لڑ کر دنیا سے ختم ہو گئے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

جب میں اس نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں تو مجھے طلوع اسلام کے یہ رد نمازوں والے مضامین خوفناک فتنہ دکھائی دیتے ہیں ـــ لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ مجھے قرآن مجید کی اس آیت میں نظر آتا ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَوٰةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم)

(اوپر بہت سے نبیوں کا ذکر ہے) پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ سو ان کی گمراہی ان کے آگے آئے گی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری مسلسل تباہیوں اور گمراہیوں کا سبب یہی ضیاع صلوٰۃ ہی ہو یعنی سرے سے ہم نماز کو کھو ہی چکے ہوں اور هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ کے طور پر اس نقصانِ صلوٰۃ کا شعور بھی ہم سے چھین لیا گیا ہو، یہ عذاب بالائے عذاب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طلوع اسلام ہمیں پھر اسی زندگی بخش نماز کی طرف بلا رہا ہو جس کے ہوتے ہوئے کوئی قوم ذلیل و نامراد نہیں ہو سکتی ـــ اتنی بات تو ایمانداری سے ماننی پڑتی ہے کہ قرآن مجید میں پانچ وقتوں کی صراحت کہیں نہیں (اگرچہ حدیث اور تواتر و تعامل کے مطابق راقم کا عمل یہی ہے) اور یہ پانچ وقت جو رائج ہیں ان کے پابند فی صد دو تین مسلمان مشکل سے ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم اپنی اکثریت کے ساتھ نماز کو کھو چکی ہے۔ اور جو نمازی ہیں ان میں کتنے ہیں جو کم از کم نماز کے ترجمے سے واقف ہیں (اور روح نماز تو ترجمے بھی بالاتر ہے) شاید وہ بھی فی صدی ایک آدھ نکل آئے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ سچ سچ کہیں یہی وجہ تو نہیں کہ فقہا نے نماز کو ایک ایسے بوجھ کی صورت میں پیش کیا جس سے انسانی زندگی کے تمام مشاغل الگ کر دیتے ہیں اور جو لوگ اس کو نباہ رہے ہیں وہ بھی عملاً انہی لوگوں کی طرح ہیں جو بے نماز ہیں یعنی ان میں کوئی اخلاقی و روحانی برتری نہیں۔ پھر نماز کی ترغیب کیسے پیدا ہو۔ مدرسے جانے والا لڑکا تو چند سال کے بعد ترقی کرتا ہوا اور لکھتا پڑھتا نظر آتا ہے۔ مگر نمازی دس، بیس، پچاس برس نماز پڑھنے کے بعد بھی ویسا ہی بدمعاملہ اور فحشا و منکر کا مرتکب ہوتا ہے، جیسے عوام الا من شاء اللہ۔ اور مستثنیات تو عوام میں بھی ہوتے ہیں۔ پھر نمازی کی فوقیت کیا رہی ـــ پھر یہی نہیں کہ پانچ وقت اپنی تعداد کے لحاظ سے بوجھل ہیں، بلکہ مزید بوجھ یہ بھی ہے کہ ان میں ایک ایک نماز اتنی لمبی ہے جو پانچ نمازوں سے بھی زیادہ وقت لیتی ہے۔ ظہر کو دیکھیے عشا کو دیکھیے اور رمضان کی تراویح پر نظر ڈالیے جس کی جماعت کا پیغمبر کی زندگی میں کہیں نشان نہیں ملتا ـــ میں نے ایک مشہور حنفی عالم سے جو معاملہ فہم اور حالات شناس بھی ہیں، کہا کہ اگر حضرت عمرؓ آج ہوتے تو تراویح کو حکماً بند کرا دیتے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا "بلکہ دُرّے لگواتے" لیکن یہی بات وہ مجمع عام میں نہیں کہہ سکتے۔ میں اور بھی بعض علماء کو جانتا ہوں جو مانتے ہیں کہ موجودہ نمازیں قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں، لیکن اس کا اعلان مناسب نہیں سمجھتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اسلام وہی ہے جو قرآن کے اندر ہے تو وہاں نہ یہ تعداد صلوٰات اور نہ تعداد رکعات اور نہ یہ سنت، نفل اور وتر کے امتیاز۔ وہاں تو وہی ہلکی پھلکی نماز نکلے گی جس کو ہر شخص آسانی سے ادا کر سکے کوئی دکاندار ہو، ملازمت پیشہ ہو، حاکم ہو، محکوم ہو، مقیم ہو، مسافر ہو، کتنا ہی کثیر المشاغل ہو، قرآنی نماز اس پر بوجھ نہیں بن سکتی ـــــ جو لوگ پانچ پڑھتے ہیں خدا ان کو توفیق دے کہ وہ اس پر مستحکم رہیں اور ان کا حق ادا کریں۔ لیکن جو بالکل ہی باغی ہو چکے ہیں، ان کو کیوں نہ دعوت دی جائے کہ وہ اپنے فارغ وقتوں کی دو نمازوں ہی کو قائم کر لیں۔ اس کی تائید حدیث سے بھی ملتی ہے۔ ابوداؤد کی حدیث ہے تین تو اس وقت یاد نہیں، مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص حضورؐ کے پاس آیا اور پوچھا مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو میرے لئے کافی ہو، آپ نے فرمایا "پانچ نمازیں ادا کیا کرو" اس نے کہا میرے مشاغل ایسے ہیں کہ میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا۔ آپ نے فرمایا "عصرین ہی ادا کر لیا کرو" اس نے کہا یہ لفظ ہماری بولی میں نہیں ہے، اس کا مطلب بتا دیجئے۔ ارشاد ہوا صَلٰوۃٌ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَصَلٰوۃٌ قَبْلَ غُرُوْبِھَا یعنی ایک نماز طلوعِ آفتاب سے پہلے اور ایک غروب سے پہلے۔

ایک اور حدیث ہے۔ مَنْ صَلَّی الْبَرْدَیْنِ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ النَّارَ۔ جس شخص نے دو ٹھنڈے وقتوں کی نمازیں ادا کیں اللہ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ـــــ اس کے علاوہ سورۃ الفرقان کی آیت

فَھِیَ تُمْلٰی عَلَیْہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا۔

صبح و شام اس کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔

کی تفسیر میں شاہ عبدالقادرؒ موضح القرآن میں لکھتے ہیں کہ شروع شروع میں مسلمان دو نمازیں پڑھتے تھے کم از کم اس سورہ کے نازل ہونے تک۔ بلحاظ نزول اس سے پہلے اہم سورتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں اعراف و یٰسین جیسی لمبی سورتیں بھی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کئی سال تک صحابہ نے دو نمازیں پڑھیں۔ پھر آج کا مسلمان دو نمازیں پڑھ کر کیوں مسلمان نہیں رہ سکتا؟

ایک بات اور بھی ہے اور وہ ہے متواتر تعامل۔ اس سے بھی قرآن کو ٹکرایا جائے گا، جب اس ترازو پر قرآن پورا نہ اترے گا تو اس غریب کو ہار ماننی پڑے گی اور تعامل کا پلہ بھاری رہے گا ـــــ اصل بات یہ ہے کہ کئی تواتر و تعامل ایسے ہوتے ہیں جو پیغمبروں کی آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہو جاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمانی سند سے بھی اونچے ہو جاتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے کئی اعمال (سوختنی قربانی، عشار، ربانی وغیرہ) اسی قبیل سے ہیں۔

معلم شرح صحیح مسلم میں ہے حضرت انسؓ (جو بہت لمبی عمر کے صحابی ہیں) نے کہا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں ہم نے جو کچھ دیکھا ہے، اب اس میں بالکل تبدیلی آگئی ہے۔ لوگوں نے کہا نماز تو وہی ہے۔ انھوں نے جواب دیا صنعتم ما صنعتم فیھا۔ اس میں بھی جو بناوٹ تم نے چاہی کر لی۔ دوسری روایت میں ہے ضیعتم ما ضیعتم فیھا۔ اس کو بھی جو نقصان

تم نے پہنچایا، پہنچایا[1]۔

میرے اس مراسلے کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ شوق جتنی نمازیں چاہیں پڑھیں، نماز اللہ کا ذکر ہے اور ذکر سے بڑی کوئی چیز نہیں بشرطیکہ اس کی حقیقت سمجھ لی جائے ـــــ لیکن ساری دنیائے اسلام کو عملِ اسلام سے قریب لانے کے لئے قرآنی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم نہ ہوں ـــ اگر ہم ساری دنیا کے سامنے اسلام کو دینِ فطرت کہہ کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ روس، امریکہ، برطانیہ وغیرہ آخر ایک دن مادیت کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر اسلام کی پناہ میں آجائیں تو وہ ہمارا موجودہ اسلام نہیں ہوگا جس کی زبانی تائید کے لئے ہم کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور عملی لحاظ سے ہم نے خود بھی اس کو متروک و مہجور کر رکھا ہے۔ عملِ اسلام میں صرف نماز روزہ وغیرہ پانچ ارکان ہی عبادت نہیں۔ بلکہ اس میں تو مومن کا ہر فعل عبادت بن جاتا ہے۔

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ قرآن میں کئی جگہ اس مضمون کی آیتیں ہیں ـــ کہ قرآن میں وہی دین نازل کیا گیا ہے جو انبیاءِ سلف پر وحی کیا گیا تھا۔ جب ہم قدیم امتوں کو اور ان کے لٹریچر کو دیکھتے ہیں تو پانچ نمازوں کا وہاں بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ صرف فرقہ مانویہ کے متعلق سنا ہے کہ وہ پانچ نمازیں پڑھتے تھے اور اس فرقے کی بنیاد کسی الہامی کتاب پر ثابت نہیں ہو سکی۔ اگر قرآن سے قدیم امتوں کے حالات تلاش کریں تو دو وقتوں سے زیادہ ثابت نہیں ہوتے۔ اس پر کئی آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن میں بالعشی والابکار، بکرۃ واصیلا، بالغدو والآصال، اور بالعشی والاشراق کی قسم کے الفاظ آتے ہیں۔

"لاہوتی"

[طلوعِ اسلام نے اس بحث کو کیوں چھیڑا؟ اس کا جواب اس تمہیدی نوٹ سے مل جائیگا جس سے اس بحث کی ابتدا کی گئی تھی۔ اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ ہمارے موجودہ مذہب میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی سند فقہ کی دی جاتی ہے، کچھ ایسی جنہیں روایات کے سلسلے سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، بعض سینہ بسینہ "علمِ لدنی" کی کشفی سندات سے مانی جاتی ہیں۔ کسی کے متعلق تعاملِ امت (عملِ متوارث) کو سند قرار دیا جاتا ہے اور کہیں کہیں قرآن کی کوئی آیت بھی پیش کر دی جاتی ہے۔ اس سارے مرکب کا نام ہے ہمارا موجودہ مذہب۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کم از کم اتنا تو دیکھ لیا جائے کہ کسی ایک عقیدہ یا عمل میں کتنا حصہ قرآنی ہے، کتنا روایتی، کتنا فقہی، کتنا کشفی اور کتنا اس کے علاوہ یوں ہی۔ اس سے اتنا تو

[1] میں جنگل میں بیٹھا حافظے کی مدد سے یہ مراسلہ لکھ رہا ہوں۔ حوالے میں کوئی لفظی غلطی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

ہوگا کہ ہم یقینی طور پر متعین کر سکیں گے کہ ہم جو کچھ مان رہے ہیں یا کر رہے ہیں اس کی سند کیا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس سلسلہ کو بنا اصلاً اسی غرض سے شروع کیا ہے اور اس بحث کو صلوٰۃ سے چھیڑا ہے کہ اسے مذہب اور دین دونوں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کوشش سے کسی نئے فتنہ کا آغاز نہیں ہوگا بلکہ بہت سے فتنوں کے ماخذ مل جائیں گے جن سے غیر اسلامی دماغوں کی راہوں سے گھسی ہوئی اختراعات کو الگ کر دینے میں سعید روحوں کو مدد مل سکے گی اور مسلمانوں کی عبودیت "مخلصین لہ الدین" کے مطابق ہو سکے گی۔ اس خدشہ کے ماتحت مریض کی تشخیص سے گریزاں رہنا کہ مبادا اس کا تپ تپ دق ثابت ہو جائے مریض سے ہمدردی نہیں، اس پر ظلم ہے۔ تپ دق کے جراثیم تشخص ہو جانے پر تھوڑے وقت کیلئے مریض کا دل تو ٹوٹے گا لیکن بروقت علاج سے اس کی جان تو بچ جائے گی۔ جو کوشش طلوعِ اسلام نے شروع کی ہے، اگر یہ اس سے بہت پہلے شروع ہو جاتی تو آج ہماری حالت ایسی نہ ہوتی۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام نے بار بار اعلان کیا ہے، طلوعِ اسلام فرقہ بندی کو قرآن کی رو سے شرک سمجھتا ہے، اس لئے وہ کسی صورت میں بھی کسی نئے فرقے کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے اس کا بھی اعلان بار بار کیا ہے کہ جزئیات کے تعین یا ان میں ردوبدل کا اختیار صرف اس مرکزِ ملت کو ہے جو قرآنی نظام قائم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ کسی فرد کو یا کسی فرقہ کو اس کا قطعاً حق حاصل نہیں۔ جیسا کہ محترم پرویز صاحب نے جون کے طلوعِ اسلام میں اپنے متعلق لکھا تھا، ہم بھی اسے دہراتے ہیں کہ ہم خود موجودہ ملتِ اسلامیہ ہی کے افراد ہیں اور خدا کی طرف سے کوئی ایسا اختیار نہیں رکھتے، نہ اس کے مدعی ہیں کہ اپنی پیش کردہ معروضات کو کسی کے سر پر بھی مسلط کر دیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے موجودہ اعمال و افکار کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیا جائے تاکہ اگر ملک کو اسلامی نظام کے قیام کی سعادت نصیب ہو تو وہ نظام وہی ہو جو ان کے خدا نے ان کیلئے تجویز کیا ہے نہ کہ وہ انسانی تخیلات جنھوں نے خدائی نقاب اوڑھ رکھا ہے۔

یہ چند حروف ہم نے صرف اس ضمن میں لکھ دیئے ہیں جس کی طرف "لاہوتی" صاحب نے طلوعِ اسلام کی اس کوشش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ باقی جو کچھ انھوں نے تحریر فرمایا ہے وہ ہم نے اپنے واضح کردہ اصول کے مطابق بغیر کسی ریمارکس کے شائع کر دیا ہے۔

بایں ہمہ یہ یاد رکھئے کہ ہم نے یہ بحث محض اس لئے چھیڑی ہے کہ قرآن سے ثابت کر دیا جائے کہ نمازوں کے اوقات کتنے ہیں۔ ہمارا مقصد ہرگز نہیں کہ کثیر المشاغل حضرات یا روس اور امریکہ جیسے ممالک کے لئے کسی قسم کی آسانی بہم پہنچائی جائے۔ قرآن کا فیصلہ واضح ہو جانے کے بعد کسی کی رعایت کا سوال باقی نہیں رہتا۔

طلوعِ اسلام

نکاتِ تلاوت

(محترم عرشی صاحب، دار القرآن، لاہور)

مختلف تاریخوں میں حاصل کئے ہوئے تلاوتی نکتے مائدہ طلوعِ اسلام پر چن رہا ہوں کہ اہلِ ذوق قارئین کو اپنی تنہائیوں کی لذتوں میں شریک کروں۔

حقیقتِ علم

زیر تلاوت رکوع میں ایک آیت سامنے آئی اس سے ایک نئی روشنی حاصل ہوئی جس پر پہلے کبھی توجہ نہیں ہوئی تھی میں تو کہتا ہوں کہ قرآنِ عزیز ہمیشہ ہی اپ ٹو ڈیٹ (up-to-date) اور دائم الجمال چیز ہے۔ اس کی جدتوں اور ندرتوں کی کوئی تھاہ نہیں۔ اس کے حسنِ لازوال کے کتنے گوشے ہیں جو ابھی اہلِ نظر مشتاقانِ جمال کی نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ ان کو کون شمار کر سکتا ہے؟ سچ کہا ہے:

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز اندکے خود را در آیاتش بسوز! (اقبال)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مفسرین نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا چڑیا سمندر سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے لیتی ہے اور قیامت تک کے غواصانِ قرآن ایسے ہی اپنی اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے اور یہ لاہوتی سمندر ایسا ہی عمیق اور اتھاہ رہیگا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

فرماتے ہیں — جب کفار کو قرآن مجید اور پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے — یعنی وہی پرانا طریقہ، شرک، کفر، فسق و فجور وغیرہ —— ان سب کے جواب پر الٰہی تنقید سننے اور سمجھنے کی چیز ہے —— ارشاد ہوتا ہے —— اولو کان اٰباؤھم لا یعلمون شیئًا ولا یھتدون۔

یعنی —— اگرچہ ان کے بزرگ باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پاتے ہیں۔

براہ کرم زیر خط الفاظ ایک مرتبہ اور دیکھیں "لا یعلمون شیئًا" یعنی — کچھ بھی نہ جانتے ہوں —— سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ مخاطبین کے آباء واجداد پشت در پشت محض بھیڑ بکری کی قسم کے حیوان لا یعقل ہی ہوتے رہے ہوں۔ کفار میں بڑے بڑے عقل مند منتظم اور حکیم و فلسفی ہو گزرے ہیں۔ ہم کس طرح مان لیں کہ وہ قطعًا کچھ (شیئًا) نہیں جانتے تھے یعنی محض پتھر تھے، کیونکہ آخر حیوان بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں، اپنی خوراک کو غیر خوراک سے، مالک کو غیر مالک سے، مسکن کو غیر مسکن سے تمیز کرتے ہیں۔ اپنے بچے کو دوسرے کے بچے سے پہچانتے ہیں۔ (وغیرہ وغیرہ) پھر کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ ابوجہل

جو ابو الحکم کہلاتا تھا اور ابو لہب جو بڑا صاحب اثر نہیں تھا اور فرعون و ہامان و قارون جو لاکھوں انسانوں پر اثر رکھتے تھے بالکل "لا یعلمون شیئاً" تھے۔ یعنی کچھ جانتے ہی نہ تھے؟

مجھ سے پوچھتے ہو تو میں بغیر کسی ایچ پیچ اور دل کی پوری تسلی اور یقین سے کہتا ہوں کہ جس نے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو نہیں جانا اس نے بہت کچھ جاننے کے باوجود کچھ بھی نہیں جانا۔ اور جس نے اس منبع حسن و جمال اور مخزن خیر و کمال کا کوئی گوشہ پالیا تو اس نے سارے علم سیکھ لئے اور ساری دولتیں حاصل کر لیں۔

جان جملہ علمہا اینست ، ایں کہ بدانی من کیم در یوم دیں (رومی)

ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ طریق حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کرتے ہیں: "حضرت! مجھے سارے علوم سکھا دیجئے تاکہ آنکھوں کے سامنے سے تمام حجاب اٹھ جائیں اور آخرت کا راستہ صاف دکھائی دینے لگے۔"

"عزیز من! تم تمام علوم پر حاوی ہو جانا چاہتے ہو" جنیدؒ نے کہا۔

"ہاں حضرت!" جواب شبلیؒ

"تو قلم، دوات اور کاغذ لے آؤ۔ آج ہم تمہیں تمام علوم لکھوا دیتے ہیں۔" ارشاد جنیدؒ

شبلیؒ اٹھے اور بھاگے بھاگے قلم، دوات اور کاغذات کا ایک ٹھا لئے ہوئے حاضر خدمت ہو گئے۔ دل میں بہت خوش کہ آج سے مبارک کون سا دن ہو سکتا ہے، شیخ اتنے مہربان ہیں کہ سارے ہی علوم سکھا دینے پر آمادہ ہیں ــــ الحمد للہ ــــ عرض کیا،

"حضرت! کاغذ، قلم، دوات حاضر ہے۔"

فرمایا ــــ "لکھو ــــ اللہ"

شبلی نے لکھ دیا اور عرض کیا:

حضرت آگے؟

فرمایا "بس۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ تمام علوم و اسرار، تمام نعائم و لذائذ، تمام دولتیں اور خوبیاں اور جو کچھ تم اور تمام مخلوقات تصور کر سکے اور جو سب کے تصورات سے باہر ہے، وہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں موجود ہے۔ اسی کو سمجھو، اسی کو جانو، اسی کو پہچانو۔ ہر مراد حاصل اور ہر مدعا میسر ہو جائے گا۔"

تم مل گئے تو دولت کونین مل گئی ، پائے طلب میں اب خلش جستجو نہیں

فرعون جب اس جہان سے رخصت ہوا، اس کے علوم، اس کی دانش بینی و فراست، اس کا دبدبہ و سیاست، اس کا دعویٰ الوہیت اور اس کے اسباب عروج و کمال کہاں تھے ــــ پاکستان کے کیمبرج اور آکسفورڈ یافتہ سیاست دانو! تمہیں اس کے

مرتے وقت کے الفاظ یاد نہیں؟ مجھ سے سنو! نہیں نہیں اس کی زبان مبارک سے سنو جو اس وقت بھی اس کے پاس موجود تھا اور آج بھی تمہاری اور میری رگِ گردن سے زیادہ ہمارے قریب ہے۔ (جل شانہ وھوالحی الذی لا یموت)

إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ —— ٹھیک اس وقت جب فرعون ڈوب رہا تھا۔

قَالَ —— اس نے کہا ——

امنت انہ لا الٰہ الا الذی امنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین ۝

میں مان گیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس کو بنی اسرائیل مانتے ہیں اور میرا سرِ تسلیم خم ہے۔

آہ اس وقت مانا جب ماننے کا کوئی فائدہ نہ رہا، جب اِدھر کی آنکھ بند ہو چکی اور اُدھر کی آنکھ کھل گئی اور جو کچھ موسیٰؑ کہتے تھے دکھائی دینے لگا —— اور اِدھر کے کان بند ہو گئے، اُدھر کی آواز سنائی دینے لگی۔

الآن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین الخ

(او ظالم!) اب مان رہا ہے حالانکہ پہلے تو نے کوئی بات نہ مانی اور فساد ہی مچاتا رہا۔

تو مطلب یہ نکلا کہ وہ معلومات جو انجام کار ہمارے کسی کام نہ آئیں، ان کا جاننا نہ جاننے کے برابر ہے، جیسے بخیل کی دولت جو اس کے کام نہیں آتی، دراصل وہ اس کی ہے ہی نہیں۔ وہ اس کے ہوتے ہوئے مفلس بلکہ مفلس سے بدتر ہے، کیونکہ مفلس اس کی حفاظت کے عذاب میں تو مبتلا نہیں۔

علم را بر دل زنی یارے بود　　علم را بر تن زنی مارے بود

علم اہلِ دل بود حمالِ شاں　　علم اہلِ تن بود احمالِ شاں

اور یوں بھی دیکھو تو اکابر انبیاء نے کون سی یونیورسٹی اور کس کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اللہ کو جانا تو سب کچھ جان لیا۔

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن　　بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

۲۔ علم غیر نافع میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم جو عربیت کے علامہ، تفسیر کے ماہر اور تقریر و تحریر کے دھنی ہیں، عملی لحاظ سے عوام سے بھی کیوں گئے گزرے ہیں۔ نہ ان کی نگاہ محتاط، نہ نیت پاک اور نہ ہی بعض اوقات ان کی زبان شائستہ ہے۔ میں نے ایسے بزرگوار "چوں بخلوت می روند" کے مجسمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، ان سے معاملہ کیا ہے۔ دنیا ان کو مقدس دینی رہنما کی حیثیت سے مانتی تھی اور مانتی ہے لیکن ان کی پرائیویٹ زندگی نہایت گھناؤنی اور خوفِ خدا سے بڑی حد تک خالی نظر آئی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ جو آیتیں وہ ہم عامیوں کو سناتے ہیں ان سے ہمارے دل کانپ جاتے ہیں۔ وقتی طور پر ہی ہم جاہلوں پہ اثر تو ہو جاتا ہے۔ لیکن ان مقدسین علمائے کرام و مشائخ عظام پر کیوں اثر نہیں ہوتا۔ یہ

خدا سے کیوں نہیں ڈرتے، ان کو عاقبت کا اندیشہ کیوں نہیں؟ آج زیر تلاوت رکوع میں اس کا جواب مل گیا ـــــ ہمارے محبوب و مولا اللہ پاک فرماتے ہیں :-

ومنہم من یستمع الیک وجعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقہوہ وفی اذانہم وقرا وان یروا کل ایۃ لا یومنوا بہا الخ

اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ آخری پیغمبر زندہ ہیں اور اپنی زبان وحی ترجمان سے قرآن پاک کی "تلاوت فرما رہے ہیں" اور سننے والے وہ ہیں جو ہمارے شمس العلماؤں سے بھی زیادہ عربی کو جاننے اور سمجھنے والے ہیں، کیوں نہ ہو ان کی مادری زبان ہے لیکن پھر بھی ان کے متعلق آسمان کا اٹل فیصلہ یہ ہے :

ترجمہ آیت ـــــ ان میں سے بعض ایسے جو (اے محمدؐ) تیری بات کو کان لگا کر سنتے تو ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر حجاب ڈال رکھے ہیں تاکہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں کو بھی حقیقت میں بہرا ہی بنا دیا ہے' وہ کوئی بھی نشان دیکھیں اس پر ایمان نہیں لاتے۔

اب سننا اور عربی دان ہونا کیا فائدہ دیسکتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ہی دل اور کانوں پر پہرے بٹھا دیں کہ کوئی حق بات اثر ہی نہ کرنے پائے۔ اور یہ جبر بھی نہیں، انسان کے اپنے میلان و رجحان کی وجہ سے اس قسم کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے تو جو لوگ علم میں پختہ ہیں ڈرتے اور دعائیں کرتے رہتے ہیں :

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا الخ

اے ہمارے رب! جب آپ ہمیں ہدایت کی دولت دے چکے تو اس کے بعد ہمارے دلوں کو کج فہمی سے بچائیو۔

یعنی ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی گمراہ ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ اور جو شروع ہی سے ہدایت کی طرف مائل نہ ہو اور محض کاروباری حیثیت سے حدیث و تفسیر کو استعمال کرتا ہو وہ اس کے مقصود حقیقی کو کیونکر پا سکتا ہے۔

رب اعوذ بک من ھمزات الشیطین واعوذ بک رب ان یحضرون۔

اے میرے رب میں شیطان کے ہتھکنڈوں سے آپ ہی کی پناہ چاہتا ہوں اور اس سے بھی آپ ہی کی پناہ چاہتا ہوں کہ میرا شیطانوں سے سابقہ پڑے۔

ہمارے نوجوانوں کی فرنگ زدگی اور الحاد پذیری کو بہت کوسا جاتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے، لیکن اس کے پس منظر کو دیکھیں تو اس میں انگریز کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ ان مقدس نما بزرگوں کا بھی کچھ کم دخل نہیں۔ جو لوگ ان کے اندرونی کرداروں سے واقف ہو جاتے ہیں وہ سرے سے دین ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں کہ جس دین کے نمائندے ایسے ہیں وہ دین کیسا ہوگا۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے

متعلق بالکل سچ ہے ع

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید (اقبال)

- لیکن تاریخ ہی بتاتی ہے کہ اکبر کا بچپن کافی دیندارانہ تھا — آخر اس وقت کے مولانا مخدوم الملک کی قسم کے بزرگ . . . . جب اس کے سامنے اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہوئے اور دوسری طرف فیضی و ابوالفیض اسے مُلّا اس کی تنگ دین سے بیزاری کا خیر مقدم کرنے کیلئے کھڑے تھے تو اسے تخمِ الحاد کی پرورش سے روکنے والا کون ہوسکتا تھا — آج بھی یہی حال ہے۔ پیرو مُلّا ایک متعفن قسم کے مذہب کو اسلام کے نام سے پیش کر رہا ہے۔ نوجوان اس سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ منہ پھیرتا ہے تو دوسری طرف اسے فرنگیت کی نازک اندام پری الحاد کا تحفہ ہاتھ میں لئے خیر مقدم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اب وہ بیچارہ کہاں جائے۔

"کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری"

۳- جرائم پیشہ قوم آج زیرِ تلاوت آیات میں آیت ذیل دل میں چبھ گئی۔

فلا یرد باسہ عن القوم المجرمین ،

جو لوگ قومی حیثیت سے جرائم پیشہ ہو جائیں ان پر سے اللہ کا عذاب ٹل نہیں سکتا۔

اس کے اوپر کی آیت کے آخری ٹکڑے نے اس کے مضمون کو اور بھی ہولناک بنا دیا ہے۔

وانا لصادقون — ہم (اللہ) قطعی سچ کہنے والے ہیں۔

مجھے اپنی قوم کا خیال آگیا۔ اکابر و اصاغر، جہلا و علما، حاکم و محکوم سب کے سب عظیم اکثریت کے لحاظ سے مجرم ثابت ہو رہے ہیں — یا اللہ! اس قوم کا کیا بنے گا؟

آوازۂ حق اگر کہیں ہے تو بہت مدہم — اور عموماً اس کے پیچھے بھی خلوص بہت کم اور وہی عوامی جرائم پیشگی اپنی طوفانی شان کے ساتھ۔ "وانا لصادقون" کہنے والے کا قول کبھی آج تک ٹلا نہیں اور اب ٹلنے کا نہیں۔ اگر اس کے علم میں روس مجرم ہے تو وہ پکڑا جائیگا — امریکہ اور اس کے حواری مجرم ہیں تو وہ بھی نہیں چھوٹیں گے۔ فریقین مجرم ہیں تو کوئی بھی نہیں بچے گا۔ دنیا بھر کے آثار اچھے نہیں۔ مہلت دینے والا بہتر جانتا ہے کہ کتنی مہلت مناسب ہے اور کب گرفت آجائیگی۔ اس تصور کے تحت آج کل میرے وردِ زباں یہی آیت رہتی ہے اور میں اپنے دوستوں کو بھی اس طرف توجہ دلاتا ہوں:

رب نجنی واھلی مما یعملون

(دعائے لوطؑ) میرے رب! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان لوگوں کی بداعمالیوں (کے نتائج) سے بچالے۔

نقد و نظر

۱۔ اسلام کا معاشیاتی نظام مصنفہ حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی۔ پبلشر کتاب منزل لاہور، ضخامت ۱۸۴ صفحات، چھوٹی تقطیع۔ کتابت، طباعت صاف، قیمت مجلد دو روپے۔

یوں تو انسانی فطرت کے تمام تقاضے انسان کے ساتھ مسلسل و متواتر چلے آرہے ہیں لیکن اس کے تمدنی نظام کے اقتضائات کے ماتحت بعض تقاضے خاص ادوار میں نمایاں حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے اعتبار سے ہمارا دور عصرِ معاشیات (Economic age) کہلاتا ہے کیونکہ اس دور میں معاشی تقاضا بڑی اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اسی عصری روح کا غیر شعوری اثر ہے کہ آج کل ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے بھی معاشی نظام کے متعلق بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اپنے دور کے تقاضوں کے حل کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ سے سوچنا بڑی نیک فال ہے، اس لئے کہ اس سے پیشتر ہمارے مذہب پرست طبقہ کا عقیدہ یہی تھا کہ دین کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا وہ سوچا جا چکا ہے اور اس سوچ کے نتیجہ میں نہ کوئی ردوبدل ہو سکتا ہے اور نہ حک و اضافہ۔

لیکن ہمارے مذہب پرست گروہ کی اب بھی عام طور پر یہی حالت ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے متعلق جب کچھ لکھتے ہیں تو ان کا دائرہ "فکر" صرف اسی حد تک محدود رہتا ہے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق فلاں روایت میں کیا آیا ہے اور فلاں امام نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی مسئلہ کے متعلق ہمارے اسلاف کی تحقیق ہمارا علمی سرمایہ ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارے لئے نفع بخشیوں کا ذریعہ ہے۔ لیکن ان کی تحقیق کے نتائج کو صرف نظائر (Precedents) کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل فیصلہ کی۔ یعنی ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں دور میں اس دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر کیا حل سوچا گیا۔ اگر ہمارے دور کے تقاضے بھی وہی ہیں اور احوالِ ظروف میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو اسی حل کو ہم آج بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر حالات میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہے تو ہمیں قرآن کے اصول اور اسلاف کے فکری نتائج کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضے کا حل خود سوچنا ہوگا۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں معاشی نظام نے جو وسعتیں اور پہنائیاں حاصل کر لی ہیں اور بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے اس میں جو نزاکتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں وہ اس سے پہلے کسی زمانہ میں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اس لئے اس تقاضے کے حل کی جو جزئیات

اس سے پہلے متعین ہوئی تھیں وہ آج کی ضروریات کی متکفل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہمیں آج اپنے دور کے تقاضوں کے حل کے لئے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کرنی ہوں گی۔

حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی سے قارئین طلوع اسلام ناواقف نہیں۔ ان کے مضامین طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں، اس لئے ان کا اسلوب قارئین کے سامنے ہے۔ کتاب زیر نظر میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں وہ صحیح نتائج تک پہنچے ہیں۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ زمین صرف اتنی کسی کے پاس ہونی چاہئے جسے وہ خود کاشت کر سکے، کسی دوسرے شخص کو زمین بٹائی پر دینا اور اس طرح اس کی محنت کے ماحصل میں بیٹھے بٹھائے شریک ہو جانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اس باب میں حکیم صاحب کو کچھ دقتیں بھی پیش آئی ہیں اس لئے کہ جیسا کہ احادیث کے معاملہ میں اکثر ہوتا ہے، مزارعت (بٹائی) کے حق میں بھی حدیثیں ہیں اور اس کے خلاف بھی، اور اسناد کے اعتبار سے دونوں قسم کی حدیثیں صحیح شمار کی جاتی ہیں۔ اس لئے ان میں توافق پیدا کرنا یا ایک قسم کی حدیثوں کو قبول کر کے دوسری قسم کی حدیثوں کو رد کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ حکیم صاحب نے اس مشکل کے حل کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> جب متعارض حدیثیں کسی مسئلہ میں وارد ہوں تو وہاں ایک اصولی طریق کار یہ ہے کہ کتاب اللہ کے اصول کلیہ اور عام اسلامی نظریات کی روشنی میں ان متعارض احادیث کا جائزہ لیا جائے اور پھر جو احادیث ان اصول عامہ سے مطابقت رکھتی ہوں ان کو اختیار کر لیا جائے اور دوسری احادیث (اگر وہ سند کے اعتبار سے لائق اعتماد ہوں) کی مناسب تاویل کی جائے۔
>
> یہ طریق استناد اس اصل پر مبنی ہے کہ حدیث دراصل کتاب اللہ کی تفسیر و تعبیر کا درجہ رکھتی ہے اور تعبیر اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے کہ وہ معبر عنہ سے مطابقت رکھتی ہو۔
>
> استناد بالحدیث کی ایک دوسری اصل جس کو بہت سے فقہاء و محدثین نے قبول کیا ہے یہ ہے کہ جب ایک طرف ایسی حدیثیں ہوں جو مفہوم کلی کو ظاہر کرتی ہوں اور دوسری طرف ایسی روایات ہوں جو خاص واقعات کی ترجمانی کرتی ہوں تو اس صورت میں اول الذکر قسم کی احادیث ہی لائق استناد ہو سکتی ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں حکیم صاحب نے ان حدیثوں کو قابل قبول قرار دیا ہے جو بٹائی کے خلاف جاتی ہیں اور ان کے برعکس انہی اصولوں کی روشنی میں ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ان احادیث کو قابل قبول قرار دیا ہے جو بٹائی کو جائز قرار دے رہی ہیں اور اس طرح خود ہماری آنکھوں کے سامنے احادیث کو دین ماننے والوں میں سے دو صاحب فکر ایسے اہم مسئلہ میں بالکل ایک دوسرے سے متضاد فیصلے کو دین قرار دے رہے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ جو مسلمان حکیم صاحب کے نتیجے کے مطابق عمل کریں وہ مودودی صاحب کے نزدیک اطاعت رسولؐ کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں اور جو لوگ مودودی صاحب کے

فیصلہ پر عمل کریں وہ غریب حکیم صاحب کے نزدیک معصیتِ رسولؐ کے جرم کے مرتکب ہو کر جہنم رسید ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے نتیجہ ظنی چیز کو دین کا معیار بنا لینے کا۔ اگر احادیث کو ان کے صحیح مقام پر رکھ دیا جائے تو نہ اس قسم کی اشکالات پیدا ہوتی ہیں اور نہ پھر ان اشکالات کے اس قسم کے حل دریافت کرنے پڑتے ہیں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

دین کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن احکام کو صرف بطورِ اصول بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں اس سے مفہوم ہی یہی تھا کہ ان کی جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں گی۔ ان جزئیات کو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین فرمایا اور ہو سکتا ہے کہ حضورؐ خود اپنے زمانے میں بھی ان جزئیات میں تغیر و تبدل فرماتے رہے ہوں (موجودہ احادیث میں باہمی تعارض اور تضاد کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے) کیونکہ ان جزئیات کو قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا اور لہٰذا نہ منشائے رسول اللہؐ۔ اس لئے رسول اللہؐ نے قرآن کو اس اہتمام سے لکھوایا اور لفظاً لفظاً حفظ کرایا اور اس کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اس اہتمام سے اس کے متعدد نسخے مرتب کرائے۔ لیکن اس کے برعکس نہ رسول اللہ صلعم نے اپنی احادیث کو کہیں لکھوایا نہ حفظ کرایا (بلکہ خود بعض احادیث کے مطابق آپؐ نے ان کی کتابت سے ممانعت کر دی) اور نہ ہی آپ کے بعد خلفائے راشدین نے ان کو لکھوایا اور نہ ہی ان کے نسخے مرتب کر کے ملت میں تقسیم کئے (بلکہ انھوں نے بعض صحابہؓ کے پاس از خود لکھی ہوئی احادیث کو تلف کرا دیا۔) اس سے احادیث کی صحیح پوزیشن متعین ہو جاتی ہے۔ اگر احادیث کو آج بھی یہی پوزیشن دی جائے تو اس قسم کی کوئی مشکل ہی پیدا نہیں ہوتی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

یہ تو رہا وہ حصہ جس میں حکیم صاحب کی تحقیق کا نتیجہ قرآنی اصل کے مطابق ہے۔ دوسری طرف وہ حصہ لیجئے جس میں حکیم صاحب نے کسی سابقہ زمانے میں متعین کردہ جزئیات کو اصل دین سمجھ لیا ہے اور جس کی وجہ سے انھوں نے دین کو ایک خاص دور کے اندر محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:

خزانہ ملی (بیت المال) کی آمدنی کے تین مستقل ذریعے ہیں۔

۱۔ خمس غنائم، ۲۔ جزیہ و خراج، ۳۔ صدقات۔

اگر خزانہ ملی کے ذرائع آمد کو انہی تین مدات تک محدود سمجھ لیا ہو اور اس تحدید کو دین قرار دے دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آج کوئی اسلامی حکومت ان مدات کے علاوہ آمدنی کی کوئی اور مد تجویز ہی نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحدید دین کا جز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سے زکوٰۃ کا اڑھائی فیصدی والا نصاب (جسے قرآن نے متعین نہیں کیا)

دین نہیں بلکہ دین کی ایک اصل کی وہ تعبیر ہے جو کسی ایک زمانہ کی ضروریات کیلئے مکتفی سمجھی گئی۔

مصارف خراج کے ضمن میں حکیم صاحب نے فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تمام مسلمانوں میں مساوات کو قائم رکھا یعنی ہر مسلمان کو بلا تفریق مدارج و مراتب برابر کا حصہ دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے (خود رسول اللہ صلعم اور حضرت صدیق اکبرؓ کے طریق عمل کے خلاف) مسلمانوں کے مدارج اور مراتب متعین کئے اور ان کے مطابق وظائف مقرر کئے۔

چونکہ عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ خلفائے راشدین کے فیصلوں کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل دین کی حیثیت دی جاتی ہے اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملت میں تقسیم مال کا دینی طریقہ وہ سمجھا جائے جو رسولؐ اللہ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے اختیار فرمایا، یا وہ طریقہ جسے حضرت عمرؓ نے اختیار فرمایا، اس لئے کہ ان دونوں طریقوں میں جزئی اختلاف نہیں بلکہ ایک بہت بڑا اصولی اختلاف ہے۔

معاشی نظام کے ضمن میں یہ چند چیزیں ہم نے یونہی بطورِ مثال بیان کر دی ہیں ورنہ اس کے متنوع گوشوں میں سے ہر ایک گوشہ ایسا ہے کہ جس پر قرآنی اصولوں کی روشنی میں دورِ حاضر کے تقاضوں کا حل دریافت کرنے کے ضمن میں شرح و بسط سے لکھا جانا ضروری ہے۔

۲۔ اسلام کا تمدنی و سیاسی نظام

(موجودہ یورپ کے مقابلہ میں) مصنف پروفیسر نکہت شاہجہانپوری۔ پبلشر، کتاب منزل لاہور۔ ضخامت ۸۰ صفحات، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت خوشگوار، قیمت مجلد پانچ روپے۔

اس سے پیشتر مذہب کے متعلق تصور یہ تھا کہ وہ تزکیہ نفس کا ذریعہ اور نجاتِ اخروی کا وسیلہ بنتا ہے اور چونکہ اسلام کو بھی ایک مذہب تصور کیا گیا تھا اس لئے اسلام کا حاصل بھی یہی کچھ قرار دیا جاتا تھا یعنی انفرادی تزکیہ نفس اور انفرادی نجات۔ اس نظریہ کے ماتحت اسلام کے متعلق بحث اور اس کے دوسرے مذاہب سے تقابل بہت آسان تھا۔ نہ تزکیہ نفس کوئی کوئی ایسی چیز تھی جسے محسوس طور پر کسی کے سامنے پیش کیا جا سکے، نہ نجاتِ اخروی کوئی ایسی محسوس شے تھی جسے سامنے لاکر دکھا دیا جائے۔ ہر مذہب کا یہی دعویٰ تھا۔ لہٰذا جب مناظرات گفتگو ہوتی تھی تو مذہب کے معتقدات یا اس کی عبادات کے متعلق مجرد گفتگو (Abstract discussion) ہوا کرتی تھی، اور جو مفاہمت پسند طبائع مناظرانہ نبرد آزمائی کو پسند نہیں کرتی تھیں وہ تصوف کے سائے میں امن کی منزل تلاش کر لیتی تھیں کہ رام بھی وہی ہے اور رحیم بھی وہی۔ فرق تسبیح اور مالا کے الفاظ میں ہے منزل دونوں کی ایک ہے۔ اطمینان قلب یا آتما کی شانتی، نجات ہو یا مکتی، اصل میں دونوں ایک ہیں۔

لیکن ہمارے اس دور میں اسلام کو بطور ایک ضابطہ حیات یا نظام زندگی پیش کیا جاتا ہے اور اس کا تقابل دنیا کے دیگر نظامہائے زندگی سے کیا جاتا ہے۔ سیاسی نظام، دولتی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، غرضیکہ اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق نظام۔ زندگی کا نظام چونکہ ایک محسوس شے ہے اور اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے اس لئے اس نظریہ کے ماتحت اب مجرد گفتگو (Abstract discussion) سے کام نہیں چل سکتا۔ اب نظام کو کسی محسوس شکل میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ جب آپ باطل کے نظام کی خرابیاں گناتے ہیں تو ان خرابیوں کو محسوس شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اس لئے اس کے مقابلہ میں جب آپ حق کے نظام کی خوبیاں گنائیں گے تو ان خوبیوں کو بھی محسوس شکل میں ہی پیش کرنا ہوگا، بطریق گفتگو تو غلط ہوگا کہ آپ مثلاً مغرب کے معاشی نظام کے متعلق بات کرتے وقت یہ کہیں کہ دیکھئے اس غلط نظام نے انسانوں کو کس قدر گروہوں اور جماعتوں میں بانٹ دیا ہے کہ جس کی وجہ سے ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا اور ایک جماعت دوسری جماعت کی جان کی دشمن بن رہی ہے اور اس کے مقابلہ میں جب آپ اسلام کے نظام کے متعلق گفتگو کریں تو اس کے نتائج حسنہ میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں کہ اس سے سب انسان اللہ والے بن جاتے ہیں۔ آپ کو ثابت یہ کرنا ہوگا کہ اس نظام سے وہ خرابیاں کس طرح پیدا نہیں ہوتیں جو غیر اسلامی نظام سے یقینی طور پر وجود میں آتی ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ اسلام کو بطور تمدنی، معاشی، معاشرتی نظام کے پیش کیا جاتا ہے لیکن نہ تو ان نظاموں کی کوئی محسوس شکل سامنے لائی جاتی ہے اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نظام کی طرف منسوب کردہ نتائج کس طرح مرتب ہوں گے، یعنی موضوع سخن محسوسات ہوتا ہے اور انداز گفتگو وہی شاعرانہ۔ شاعرانہ سے مراد ہے محض الفاظ — نہایت حسین اور جاذب الفاظ، نہایت بلند آہنگ ترکیبات اور جنت نگاہ تشبیہات۔ دنیا اس وقت اس تلاش میں ہے کہ اسے کہیں سے وہ نظام زندگی مل جائے جس کے نتائج وہ ہوں جنہیں اسلامی نظام کے نتائج کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذہن میں آج فی الواقعہ وہ نظام ہو جسے اسلامی نظام کہا جاتا ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ اس نظام کو "شاعری" کی بجائے متعین اور محسوس (Definite and Concrete) شکل میں پیش کرے۔ ہم ہر اس کتاب کی طرف جسے اسلامی نظام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے لپک کر دوڑتے ہیں کہ شاید اسی گرد میں وہ شاہسوار چھپا ہو جس کی تلاش میں ہم للچائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہیں لیکن کتاب پڑھنے کے بعد یہ افسوس رہ جاتا ہے کہ یہ خاک بھی خالی گرد ہی نکلی۔ زیر نظر کتاب کی یہی کیفیت ہے۔ اس میں بھی وہی شاعری ہی شاعری ہے۔ "شاعری" کہہ دینے سے شاید آپ کو یہ خیال گزرے کہ ہم یونہی زیادتی کر رہے ہیں اور مصنف پر بھی یہ چیز شاید گراں گزرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اصطلاح کے علاوہ دوسری اصطلاح اس مفہوم کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کو دیکھئے:

"یہ ہے آفتاب طلوع ہو چکا۔ دنیا والے اپنی معاشی تدبیروں میں منہمک ہو گئے۔ بازاری معاملات اونچی پینگ لے رہے ہیں۔

کسی نے ہزار کمائے اور کسی نے چار پیسے، مگر رزاقِ مطلق نے سب کو پہنچایا اور سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔

اس میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ رزاقِ مطلق نے سب کو پہنچایا اور سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔ اب اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ "اگر رزاقِ مطلق سب کو پہنچاتا ہے اور سب پیٹ بھر کر کھاتے ہیں تو یہ جو ہر روز سننے اور دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے ہاں کی آدھی آبادی رات کو فاقے سوتی ہے اور ایک بنگال کے قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے مر گئے۔ اس کی رزاقیت کے علی الرغم کیا ہو رہا ہے" تو فرمائیے کہ اس کا جواب کیا دیا جائے گا۔ یہ ٹھوس واقعات ہیں جن سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ اس لئے جب ہم خدا کو بطور رزاقِ مطلق مانتے اور پیش کرتے ہیں تو ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم ان ٹھوس واقعات کا بھی کچھ جواب دیں۔ جو شخص ہر روز ان لاکھوں بھوکوں کو دیکھتا ہے وہ محض آپ کے کہہ دینے سے خدا کو رزاقِ مطلق کس طرح مان لیگا۔ ہم نے یہ چیز محض ایک مثال کے طور پر پیش کی ہے۔ مقصد ہمارا یہ ہے کہ ہمیں اب اپنے اندازِ گفتگو کو بدلنا چاہئے اور لفظی شاعری کی بجائے بات ٹھوس، متعین اور ٹھیک ٹھیک Concrete, definite, Precise and Exact کرنی چاہئے ورنہ اس قسم کے انداز سے ہمارا نوجوان طبقہ اسلام سے قریب آنے کی بجائے اس سے اور دور بھاگتا چلا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دور کی متعین مشکلات (Definite Broblems) کا متعین حل مانگتا ہے۔ مجرد گفتگو سے اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

۳۔ مردِ مومن | مصنف۔ میر ولی الدین صاحب، صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ، پبلشر کتاب منزل، لاہور۔ حجم ۲۱۲ صفحات، چھوٹی تقطیع۔ قیمت مجلد دو روپے چار آنے۔

میر صاحب کے مختلف مضامین کا مجموعہ "قرآن اور سیرت سازی" کے نام سے تقسیم ہند سے پہلے شائع ہوا تھا۔ اب "پاکستان کی نئی ضرورت اور مقتضیات کے پیشِ نظر یہی مجموعہ مردِ مومن کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔" یہ نہیں بتایا گیا کہ کتاب کے نام کی اس تبدیلی سے پاکستان کی نئی ضروریات اور مقتضیات کس طرح پوری ہو جائیں گی۔ میر صاحب فلسفہ کے پروفیسر ہیں لیکن ان کے یہ مضامین تصوف کو عین دین ثابت کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ وہ تصوف جس میں "بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں اسرارِ لطف و رحمت نظر آنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ان سے ربط قائم کر لیتا ہے۔ اور سبھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے خالی ہو جاتا ہے۔" (ص۳۱) ساری کتاب اسی قسم کی تعلیم کی حامل ہے اور اُسی قسم کی "شاعری" کی آئینہ دار جس کی طرف ہم اوپر کی سطور میں اشارہ کر چکے ہیں۔ مثلاً میر صاحب فرماتے ہیں،

جو قادرِ مطلق نہ ہو، وہ معبودِ حقیقی کب بن سکتا ہے جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے،

ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے؟ (ص۲۷۱)

ہر اللہ والا اس کی شکایت کرتا رہتا ہے کہ دنیا میں شیطانی قوتیں بے لگام پھر رہی ہیں، باطل کا دور دورہ ہے ہر جگہ برائیاں چھا رہی ہیں، حق پرستوں پر دنیا تنگ ہے، چاروں طرف باطل کا غلبہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے خود میر صاحب کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ آج دنیا میں حق کا غلبہ شاید ہی کہیں نظر آئے۔ ان واقعات کی موجودگی میں اگر کوئی یہ پوچھے کہ معبود حقیقی وہی ہو سکتا ہے جو شر پر غالب ہو تو پھر اس معبود حقیقی کی موجودگی میں یہ شر کا غلبہ کیوں ہے؟ تو فرمائیے اس کا کیا جواب ہے؟ یونہی شاعرانہ بات کرکے آگے نکل جانا ایک قلب متجسس میں سینکڑوں اعتراضات پیدا کر دیتا ہے مصنف کا کام یہ ہے کہ جب وہ ایک دعویٰ کرے تو اس کی دلیل بھی ہم پہنچائے اور جب واقعات اس کے دعویٰ کی تغلیط کر رہے ہوں تو یہ بتائیے کہ اس کا دعویٰ کس طرح سچا اور واقعات کس طرح جھوٹے ہیں۔ جب تک ہم حقائق کی دنیا میں رہنا نہیں سیکھیں گے، جب تک ہم واقعات Facts کا آمنا سامنا کرنے کے عادی نہ ہو جائیں گے، ہم دنیا میں اسلام کی برتری اور بلندی ثابت کرنا تو ایک طرف خود ہی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ کارگہ فطرت میں مقدس آرزوئیں، حسین تمنائیں زندگی کا آسرا نہیں بنا کرتیں لا بامانیکم ولا بامانی اھل الکتاب۔ زندگی کی عمارت ٹھوس بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے، شاعرانہ تصورات پر نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن زندگی کی عمارت کے لئے اسی قسم کی ٹھوس بنیادیں مہیا کرتا ہے لیکن اس اسلام نے جو عجمی تصورات سے مستعار لیا گیا ہے ہمیں ہمیشہ یہ سکھایا ہے کہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لو اور تصورات کی دنیا میں مگن ہو کر بیٹھے رہو۔ وہ دین خدا کا دیا ہوا تھا، یہ تصورات انسانوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان سراپا انسان پرستی میں غرق ہے۔ چنانچہ خود زیر نظر کتاب کا انتساب ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

> میں اپنی اس پیشکش کو مولائی و آقائی حضرت ——— صاحب قبلہ
> مرحوم و مغفور کے اسم گرامی پر معنون کرتا ہوں۔

قرآن کا دین کسی انسان کو "مولی اور آقا" بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ "انت مولانا" صرف خدا کو کہتا ہے۔

معراج انسانیت

یعنی

سیرۃ صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام قرآن کے آئینہ میں

مصنفہ جناب پرویز

قیمت تین روپے

فرد و ملّت

ملّت کی عمارت ابھی تیار نہیں
ساماں تو موجود ہے معمار نہیں
ترشی ہوئی اینٹوں کے کچھ انبار تو ہیں
اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

کچھ رابطۂ دیں ہیں تفکّر بھی تو ہو
امت کے تعلّق کا تاثُّر بھی تو ہو
بن جائیگی ملّت ان کے ملنے سے مگر
افراد میں ملّت کا تصوُّر بھی تو ہو

افراد کا مذہب کی فضا میں پلنا
اسلام کے سانچے میں نہیں ہے ڈھلنا
کیا یہ کبھی ممکن ہے کہ فرداً فرداً
ہم سیکھ سکیں قدم ملا کر چلنا

اسد ملتانی

ناقابلِ فراموش انقلاب

جس نے اقوامِ عالم (کے قلب) پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کردیا۔

گبن (مصنف "زوال و سقوط روما") ان الفاظ میں اس انقلاب کا تذکرہ کرتا ہے جسے محمد صلعم نے پیدا کیا۔ اسی ناقابلِ فراموش انقلاب کی روح پرور داستان کا حامل قرآن ہے۔

اِس

داستانِ انقلاب کو

قرآن ہی کی روشنی میں دیکھئے

معراج انسانیت

کے عنوان سے جناب پرویز کے حقیقت نگار قلم نے قرآن کے ماخذ سے اس داستان کو منضبط کیا ہے سیرت کی اپنی قسم کی پہلی کتاب جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔

قیمت: بیس روپے - محصولڈاک علاوہ

انبیائے سابقہ

کی دعوات انقلاب کو بھی اسی طرح جناب پرویز نے قرآن ہی کے ماخذ سے "تاریخ رسالت" کے نام منضبط کیا ہے۔

قیمت پندرہ روپے - محصولڈاک علاوہ -

ادارہ طلوعِ اسلام - رابسن روڈ - کراچی

وقت کی بہترین کتابیں

معراجِ انسانیت	علامہ پرویز	۲۰/-
تاریخِ رسالت	" "	۱۵/-
اقبال اور قرآن	عارف بٹالوی	۵/-
آگ اور خون	" "	۴/-
جنت میں مشاعرہ	" "	۳/-
عشرت	" "	۲/۸
مسئلہ ملکیتِ زمین	مودودی صاحب	۱/-
اشتراکیت اور اسلام	مسعود عالم ندوی	۲/۸
پردہ اور قرآن	امین احسن	-/۶
قومی ملکیت	نعیم صدیقی	-/۱۲
اسلام اور سود	انور اقبال قریشی	۳/۸
بلاغ الحق	حافظ محب الحق صاحب	۲/۸
حیاتِ نبی	عبدالعلی خاں	۱/۸

نوٹ: محصول ڈاک ہمارے ذمہ صرف اقبال اور قرآن کیلئے۔

پتہ

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

اسلام اور تجارت

تجارت ہی وہ سنہری اصول تھا جس سے مسلمان انفرادی اور مجموعی طور پر الگ ہو کر مفلس، حقیر اور ذلیل ہو گیا۔ کیا وہ دورِ عظمت واپس آسکتا ہے ——— ؟

یقیناً

یہ ٹھیک ہے کہ آپ تھوڑے سے سرمائے سے کاروبار شروع نہیں کر سکتے لیکن تھوڑا سا سرمایہ مشترکہ کاروبار میں لگا کر منافع بخش کاروبار میں برابر کے شریک تو ہو سکتے ہیں۔

آپ

قومی مشترکہ ادارہ کتاب لمیٹڈ کا ایک حصہ خرید لیں ہماری محنت اور دیانت سے گھر بیٹھے نفع حاصل کرتے رہیں۔ جبکہ ذمہ داری بھی مشترکہ ہے۔ ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے۔

"اقبال اور قرآن" ہماری پہلی پیش کش ہے۔

پتہ

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی